یکم اپریل ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۷

پندرہ روزہ
معارف فیچر
کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر:
سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱_۹۲)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہوسکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

اسرائیلی فوج کیسے فلسطینیوں کو 'شاوِش' بنا رہی ہے

نوٹ: ذیل میں دیا گیا مضمون ایک اسرائیلی فوجی نے اسرائیلی اخبار "ہارٹز" کے لیے لکھا۔ اخبار نے مضمون لکھنے والے اس فوجی کی شناخت کو خفیہ رکھا ہے۔

غزہ میں اسرائیلی فوج (آئی ڈی ایف) کی تقریباً ہر پلاٹون فلسطینیوں کو غلام بنا کر انہیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ معصوم فلسطینیوں کو روزانہ اسلحے کے زور پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ غزہ کے گھروں میں جائیں تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ وہاں دہشت گرد یا بارودی مواد تو نہیں۔

یہ انتہائی شرمناک بات ہے کہ آئی ڈی ایف کی ملٹری پولیس اس حوالے سے صرف ٦ مقدمات ہی چلا رہی ہے حالانکہ اسرائیلی فوجی روزانہ کم از کم ٦ بار اس جنگی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

میں غزہ جنگ میں ۹ ماہ تک موجود رہا اور میں نے دسمبر ۲۰۲۳ء میں پہلی بار وہ وحشیانہ 'مچھر پروٹوکول' (ماسکیٹو پروٹول) نامی طریقہ کار دیکھا جس کے تحت فلسطینیوں کو انسانی ڈھال بنایا جاتا تھا۔

یہ غزہ پر زمینی حملہ شروع ہونے کے محض ۲ ماہ بعد کی بات تھی اور فلسطینیوں کو انسانی ڈھال بنانے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اسرائیلی فوج کے پاس تربیت یافتہ کھوجی کتوں کی کمی ہے جبکہ ایسا نہیں تھا۔ مجھے اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ فلسطینیوں کا انسانی ڈھال کے طور استعمال اتنا عام ہو جائے گا۔

اسرائیلی فوجی انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیے جانے والے فلسطینیوں کو 'شاوِش' کہتے ہیں۔ آج کل غزہ میں تقریباً ہر پلاٹون اپنا ایک 'شاوش' رکھتی ہے اور کوئی بھی فوجی دستہ کسی گھر میں اُس وقت تک داخل نہیں ہوتا جب تک کہ 'شاوش' اسے 'کلیئر' نہ کرلے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کمپنی میں ۴، ہر بٹالین میں ۱۲ اور ہر بریگیڈ میں کم از کم ۳٦ فلسطینی غلام موجود ہوتے ہیں۔ ہم دراصل غلاموں کی ایک ذیلی فوج چلا رہے ہیں۔

اس کا طریقہ کار بالکل سادہ ہے معصوم فلسطینیوں کو زبردستی گھروں اور سرنگوں میں داخل ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے تاکہ وہ یہ چیک کریں کہ آیا وہاں دہشت گرد یا بارودی مواد تو موجود نہیں۔

میں حال ہی میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ آئی ڈی ایف کی ملٹری پولیس نے فلسطینی شہریوں کو انسانی ڈھال بنانے کے صرف ٦ مقدمات ہی کھولے ہیں، یہ دراصل معاملہ دبانے کی کوشش ہے کیونکہ اگر واقعی انہیں اپنا کام سنجیدگی سے کرنا ہوتا تو انہیں کم از کم ہزاروں مقدمات کی تحقیقات کرنی پڑتی لیکن درحقیقت یہ محض ایک ڈھونگ ہے اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش ہے کہ ہم خود اپنی فوج کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں۔ صرف ٦ مقدمات کی تحقیقات کرکے ان کے ذمہ داروں پر ہی تمام ذمہ داری تھوپ دی جائے گی اور دیگر کو بچا لیا جائے گا۔

میں ایک ایسی میٹنگ میں موجود تھا جہاں ایک بریگیڈ کمانڈر نے ڈویژن کمانڈر کو ماسکیٹو پروٹوکول ایک 'ضروری آپریشنل کامیابی' کے طور پر پیش کیا جو مشن کو مکمل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ 'شاوش' کا استعمال اس قدر عام بات بنا دی گئی تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

اگست ۲۰۲۴ء میں جب یہ خبر 'ہارٹز' اخبار اور 'بریکنگ دی سائلنس' کی رپورٹ میں سامنے آئی تو ایک اعلیٰ ذرائع نے بتایا کہ فوج کے سابق اور موجودہ سربراہان اس طریقہ کار سے واقف تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون سی بات زیادہ تشویشناک ہے، یہ کہ وہ اپنی ہی فوج کے حالات سے واقف نہیں تھے یا یہ کہ وہ یہ سب جانتے ہوئے بھی خاموش رہے۔

اس خبر کو شائع ہوئے ۷ ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن اسرائیلی فوجی اب بھی فلسطینیوں کو گرفتار کرکے انہیں گھروں اور خطرناک سرنگوں میں جانے پر مجبور کر رہے ہیں جبکہ چیف آف اسٹاف اور جنوبی کمانڈ کے سربراہ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، یہ وحشیانہ طریقہ کار فوج میں مزید پھیل چکا ہے اور معمول کا حصہ بن گیا ہے۔

میدان جنگ میں موجود سینئر ترین افسران ایک سال سے زیادہ عرصے سے فلسطینیوں کے بطور انسانی ڈھال استعمال سے واقف ہیں لیکن کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے تو ایک 'آپریشنل ضرورت' قرار دے دیا گیا۔

اندرونی صفحات پر

- مسلمانوں کی سیاسی بے وزنی اور دہلی کی افطار پارٹیاں
- لبرل اِزم کی بقا کا سوال
- یورپ اور امریکا کی الگ ہوتی راہیں
- دہلی فسادات کے ۵ سال
- ایشیا شدید عدم توازن کی زد میں
- امریکا تباہی کے راستے پر
- امریکی راز چُرانا کبھی اتنا آسان نہ تھا
- ایڈورائم ۲۸۰ اور فلسطینی زمینوں کی چوری

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہم انسانی ڈھال استعمال کیے بغیر بھی گھروں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ہم نے مہینوں تک ایک مناسب طریقۂ کار کے تحت یہ کام کیا ہے جس میں روبوٹ، ڈرون یا کھوجی کتے گھروں میں بھیجے جاتے تھے، یہ طریقہ کار کامیاب رہا مگر اس میں وقت لگتا تھا اور ہائی کمانڈ کو تو فوری ’کامیابیاں‘ درکار تھیں۔

دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے فلسطینیوں کو انسانی ڈھال اس لیے نہیں بنایا کہ اس سے اسرائیلی فوجیوں کی حفاظت ہوتی تھی بلکہ ہم اس لیے ان نہتے فلسطینیوں کو استعمال کرتے ہیں کہ اس سے وقت کی بچت ہوتی ہے۔ ہم نے ان معصوم فلسطینیوں کی جانیں خطرے میں ڈالیں جن کا واحد قصور بس اتنا تھا کہ وہ غلط وقت پر غلط جگہ موجود تھے۔

ماسکیٹو پروٹوکل کی کچھ مزاحمت بھی ہوئی، کچھ سپاہیوں اور افسران نے مخالفت کی، میں خود نے بھی مخالفت کی لیکن یہی ہوتا ہے جب اعلیٰ کمانڈ اور خصوصاً سیاستدانوں کو کوئی پروا نہ ہو۔ یہی ہوتا ہے جب آپ کو گولیاں چلانے کی لت لگ جائے اور آپ آپریشنل طور پر بالکل تھک چکے ہوں۔ یہی ہوتا ہے جب آپ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ لڑ رہے ہوں جو مہینوں گزرنے کے باوجود یرغمالیوں کو زندہ واپس لانے میں ناکام رہی ہو۔ نتیجے کے طور آپ اپنی اخلاقیات کھو دیتے ہیں۔

میرا ایک دوست جو فوج میں افسر ہے، نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ انہیں ایک ایسے گھر میں فلسطینی جنگجو ملا جس گھر کو ’شاوش‘ پہلے ہی ’کلیئر‘ کر چکا تھا۔ وہ ’شاوش‘ ایک بوڑھا شخص تھا اور جب اسے احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے تو وہ اتنا خوفزدہ ہوا کہ اس نے اپنے کپڑے خراب کر لیے۔ میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آخر کار اس کا کیا انجام ہوا کیونکہ میں اس سوال کے ممکنہ جواب سے ڈر گیا تھا۔

یہ ایک واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسانی ڈھالوں کے استعمال کے لیے جو سیکورٹی کا بہانہ بنایا گیا تھا، وہ جھوٹ تھا۔ یہ فلسطینی تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے، انہیں گھروں میں بارودی مواد ڈھونڈنے کا طریقہ نہیں آتا۔ فوجی بھی ان پر بہرحال بھروسہ نہیں کرتے کیونکہ یہ فلسطینی اپنی مرضی سے یہ کام نہیں کرتے۔ کبھی کبھی ’شاوش‘ کو گھروں میں صرف اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ ان گھروں میں آگ لگا دی جائے یا انہیں دھماکے سے اڑا دیا جائے۔ اس کا فوجیوں کی حفاظت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

میں یہ سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ اس کا ان عام لوگوں کی نفسیات پر کیا اثر ہوتا ہوگا جنہیں مسلح فوجیوں کی جگہ خوفزدہ حالت میں سرنگوں میں جانا پڑتا ہے۔ میں اس بات پر بھی کانپ اٹھتا ہوں کہ اس کا ہم اسرائیلیوں پر کیا اثر پڑ رہا ہوگا۔

کیا ہر وہ اسرائیلی ماں جو اپنے بیٹے کو غزہ میں جنگ پر بھیجتی ہے، اس بات کو سمجھتی ہے کہ اس کا بیٹا اپنے والد یا چھوٹے بھائی کی عمر کے فلسطینی کو اسلحے کے روز پر کسی خطرناک گھر یا بارودی سرنگ میں اپنے آگے چلنے پر مجبور کرے گا۔ ہم نہ صرف اپنے فوجیوں کی حفاظت میں ناکام رہے ہیں بلکہ ہم نے ان کی روحوں تک کو داغ دار کر دیا ہے۔ یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ جنگ سے واپس آنے کے بعد یہ ہمارے معاشرے کو کس طرح متاثر کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ ملٹری پولیس کی تحقیقات اتنی غصہ دلانے والی ہے۔ پہلے سپاہیوں کو فلسطینیوں کو انسانی ڈھال بنانے پر مجبور کیا جاتا ہے، پھر افسران جونیئر سپاہیوں کو اپنی انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ سب کچھ اُس وقت ہو رہا ہے جب ہم اب بھی یرغمالوں کو واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں جنہیں کچھ حد تک حماس کی طرف سے انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

یہ واضح تھا کہ فلسطینی شاوش کا یہ معاملہ کسی بھی وقت منظر عام پر آ سکتا تھا لیکن یہ معاملہ ملٹری پولیس کے بس سے باہر ہے، صرف ایک آزاد ریاستی تحقیقاتی کمیشن ہی اس معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔

پھر ہمارے پاس بین الاقوامی عدالتوں کے بارے میں بھی فکر مند ہونے کی ہر وجہ موجود ہے کیونکہ یہ ماسکیٹو پروٹوکول ایک جرم ہے، ایک ایسا جرم جسے اب فوج بھی تسلیم کرتی ہے اور اس جرم کا ارتکاب روزانہ ہوتا ہے۔ (ترجمہ: ادارہ)

"In Gaza, almost every IDF platoon keeps a human shield, a sub-army of Palestinian slaves". ("haaretz.com". March 30, 2025)

* * *

بقیہ: دہلی فسادات کے ۵ سال

سُنی، جن کا نقصان ہوا تھا۔ انہوں نے عام طور پر اپنی تشخیص کی کوئی وجہ نہیں بتائی اور تشخیص کے خلاف اپیل کی ایک بھی شق نہیں تھی۔ یہ سب فطری انصاف کے تمام اصولوں کے خلاف ہے۔

تشدد کا نشانہ بننے والوں کے بنیادی حقوق پر حملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ کمیشن کی طرف سے جن درخواستوں کا فیصلہ کیا گیا ہے، ان میں معاوضے کی سطحیں طے کی گئی ہیں جو کہ اصل نقصانات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ لیکن کمیشن نے کہا کہ اس کے پاس معاوضے کی معمولی رقم بھی تقسیم کرنے کے لیے فنڈ نہیں ہیں۔ ۲۰۲۰ء اور اس کے بعد کے تمام سالوں کے لیے ریاستی حکومت کے بجٹ کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ بجٹ میں معاوضے کی ادائیگی کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی علیحدہ بجٹ رکھا گیا تھا۔

دہلی حکومت کے تقریباً ۷۵ ہزار کروڑ روپے کے کل بجٹ میں، یہاں تک کہ فراخدلانہ معاوضے کے انتظامات بھی اس کی کل رقم کے ۱-۲ فیصد سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے، ۲۰۲۰ء کے دہلی کے فرقہ وارانہ تشدد کے متاثرین کو معاوضہ دینے سے انکار فنڈز کی کمی کی وجہ سے ہونے والی غلطی نہیں تھی۔

۲۰۲۰ء کے دہلی فرقہ وارانہ تشدد کے بعد پولیس نے ۷۵۸/ ایف آئی آر درج کیں، جن میں سے ایک میں دعویٰ کیا گیا کہ شہریت ترمیمی قانون ۲۰۱۹ء کے خلاف احتجاج کرنے والے اور امدادی کاموں میں سرگرم افراد دراصل سازشی تھے جنہوں نے فرقہ وارانہ قتل عام کا منصوبہ بنایا تھا۔

گزشتہ اپریل میں ہائی کورٹ کو دیے گئے ایک بیان میں پولیس نے کہا تھا کہ ۲۸۹ مقدمات میں تحقیقات اب بھی جاری ہیں۔ عدالت میں ۲۹۶ مقدمات زیر التوا ہیں اور ۱۷۳/ مقدمات کو عدالت نے خارج کر دیا ہے۔

محمد شہزاد کا کروڑوں روپے کا دھرم کانٹا جل گیا، تاہم انہیں صرف ساڑھے ۱۲/ ہزار روپے معاوضہ دیا گیا۔ شہزاد نے کہا، ’کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں یہاں کیوں پیدا ہوا؟ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جسے آپ انصاف کہہ سکیں۔ میرا کیا قصور ہے کہ مجھے اتنا برداشت کرنا پڑا؟‘

یا سلیم، جس نے ایک ہجوم کو اپنے بھائی کو گولی مارتے ہوئے اور پھر جلاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا کارخانہ اور گھر جلا دیا گیا، اور وہ اپنے بچوں کو کھلانے اور پڑھانے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ انہوں نے کہا، ’زندگی بہت مشکل ہے۔ لیکن مجھے پیسے نہیں چاہیے۔ مجھے اپنے بھائی کے لیے انصاف چاہیے، مجھے اس سفاکی کی سزا چاہیے جس کے ساتھ اسے مارا گیا۔‘

اس نے آہستہ سے کہا، ’اگر مجھے انصاف نہیں ملا تو میں اپنی جان لے لوں گا۔‘

لیکن کیا کسی نے انہیں سنا؟۔۔ کیا کسی کو ان کی پروا ہے؟

(بحوالہ: ’’دی وائر اردو ڈاٹ کام‘‘۔ ۲۰ مارچ ۲۰۲۵ء)

مُسلمانوں کی سِیاسی بے وَزنی اور دَہلی کی اِفطار پارٹیاں

افتخار گیلانی

ابھی حال ہی میں ہندوستان کے شمالی اتراکھنڈ صوبہ کے ہری دوار کے ایک کالج میں ہندو انتہا پسندوں نے مسلم طلبہ کی طرف سے منعقد افطار پارٹی کو درہم برہم کر دیا۔ بعد میں پرنسپل نے بھی مسلم طالب علموں کو افطار کے وقت کھانا لانے اور اس کو دیگر طلبہ کے ساتھ ساجھا کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ اسی طرح میرٹھ کی ایک یونیورسٹی کے احاطہ میں نماز ادا کرنے پر ایک طالبعلم کے خلاف پولیس نے ایف آئی آر دائر کی۔

ایک وقت تھا، خاص طور پر دارالحکومت دہلی میں، کہ رمضان میں سیاسی و سماجی رہنماؤں، سیاسی جماعتوں، سفارت خانوں اور دیگر تنظیموں کی جانب سے افطار پارٹیاں منعقد کرنا اور اس کی آڑ میں رابطہ اور باہمی میل جول بڑھانا قابلِ اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

صدارتی محل یعنی راشٹرپتی بھون، وزیراعظم ہاؤس، وزیروں و سیاسی جماعتوں کے دفاتر میں رمضان کے دوران اذان کی آواز گونجتی تھی اور مدعو مسلمان باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔ کئی بار تو وزیروں کو نماز کے لیے مصلّے بچھاتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔

جیسے جیسے مسلمانوں کو ۲۰۱۴ء کے بعد سیاسی طور پر بے وزن کر دیا گیا ہے، دہلی کی افطار پارٹیاں بھی قصۂ پارینہ بن گئی ہیں۔

موجودہ حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنما بھی اپنے گھروں پر افطار پارٹیاں منعقد کرتے تھے۔ اس کے رہنما سابق وزیر سید شاہنواز حسین اور وجۓ گوئل کی افطار پارٹیاں دہلی کے اشرافیہ اور صحافیوں میں خاصی مشہور ہوتی تھیں۔ وجۓ گوئل تو پرانی دہلی میں سحری کا انتظام کرتے تھے۔ رات بھر ایک سماں ہوتا تھا۔

کانگریس پارٹی کی افطار پارٹی کی ایک الگ ہی شان ہوتی تھی، جو اس کے دفتر میں منعقد ہوتی تھی۔ ملک بھر کے کانگریس کے رہنما دہلی وارد ہو کر اس میں شرکت کرتے تھے۔ بعد میں کئی بار پارٹی کو اس کو دفتر کے بجائے اشوکا ہوٹل میں منعقد کروایا گیا۔ پارٹی صدر سونیا گاندھی خود روزہ داروں کو افطار کرواتی تھیں اور ہر میز پر چند لمحے توقف کر کے سبھی کا حال چال پوچھتی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ بی جے پی نے اپنے دفتر اشوکا روڈ میں ۱۹۹۸ء میں ایک افطار پارٹی کا انعقاد کیا تھا۔ چونکہ اس کے بعد وہ حکومت میں آئی تھی، اس لیے وزیراعظم بننے کے بعد اٹل بہاری واجپائی پارٹی دفتر کے بجائے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر ہر سال اس کا نظم کرتے تھے۔ ۲۰۱۴ء سے قبل ماہِ مبارک کی آمد کے ساتھ ہی سیاسی و سماجی اداروں کی طرف سے افطار پارٹیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا تھا۔

خبروں کے متلاشی صحافیوں، طبقۂ اشرافیہ، سیاسی و مذہبی رہنماؤں نیز سفارت کاروں کے لیے افطار پارٹیاں سیاسی و سفارتی شخصیات کے ساتھ غیر رسمی روابط اور سیاسی حالات کی نبض پرکھنے کا ذریعہ بھی بنتی تھیں۔ اس مقدس ماہ میں سیاسی و سفارتی سرگرمیاں اس قدر عروج پر ہوتی تھیں کہ میڈیا اداروں میں افطار پارٹیاں کور کرنے کے لیے باضابطہ رپورٹروں کی بیٹ لگتی تھی۔

وزیراعظم ہاؤس یا راشٹرپتی بھون میں حکومت اور عدلیہ کے اعلیٰ اہلکاروں کے ساتھ بالمشافہ ملاقاتیں ہوتی تھی اور خاصی آف دی ریکارڈ انفارمیشن حاصل ہوتی تھیں۔ مخلوط حکومتوں کے دوران اس بات کی اہمیت بڑھ جاتی تھی کہ حکومتی اتحاد کے کس لیڈر نے افطار پارٹی میں شمولیت کی اور باڈی لنگویج کیسی تھی اور حکومت پر کس طرح کے خطرے منڈلا رہے ہیں۔

صاحبِ اختیار و استطاعت افراد اس ماہ کا بھرپور فائدہ اٹھا کر کچھ مسلمانوں کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے بطور، مگر زیادہ تر اپنے آپ کو سیکولر جتانے اور اس کی نمائش کے لیے افطار پارٹیوں کے ذریعے اپنا ووٹ بینک پکا کروانے کا بھی سامان کرتے تھے۔

۱۹۹۸ء میں بی جے پی کے صدر دفتر پر منعقد افطار کی تقریب میں جب میں پہنچا تو دیکھا کہ پارٹی آفس کے وسیع و عریض لان میں شامیانہ لگا ہوا تھا، جس کے دروازے پر خود واجپائی اور چند دیگر رہنما ٹوپی پہنے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ابھی افطار میں آدھا گھنٹہ باقی تھا، مگر شامیانہ کے اندر چائے سموسہ اور کھجوروں کا دور چل رہا تھا۔ لوگ آرام سے کھا پی رہے تھے، افطار کے وقت کا کسی کو احساس نہیں تھا۔

سید شاہنواز حسین، جو بعد میں مرکزی وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے، ان دنوں بی جے پی کی یوتھ ونگ کے لیڈر تھے۔ بستی نظام الدین اور دیگر علاقوں سے چنندہ مسلمانوں کو افطار پارٹی میں لانے کی ذمہ داری ان کو دی گئی تھی۔ وہ کیٹرنگ والے سے الجھ رہے تھے کہ افطار سے قبل ہی انہوں نے ناشتے کی قابیں کیوں سجائی ہوئی تھیں۔

خیر جب افطار کا وقت ہوا، تو خالی قابیں روزہ داروں کو منہ چڑا رہی تھیں۔ کسی طرح پانی وغیرہ پی کر روزہ تو کھولا۔ اب مغرب کی نماز ادا کرنے کا کوئی نظم نہیں تھا۔ جن مسلمانوں کو تقریب میں لایا گیا تھا وہ شاہنواز پر برس رہے تھے۔ کسی طرح انہوں نے دفتر کے پچھواڑے میں نماز کے لیے لان کو صاف کروایا۔

اب جس وقت روزہ دار نماز ادا کر رہے تھے، کیٹرنگ والے نے ڈنر پیکٹ بانٹنے شروع کر دیے۔ بجائے قابوں میں کھانا پروسنے کے، پارٹی نے ڈنر پیکٹوں کا انتظام کیا ہوا تھا۔ جب تک نماز ختم ہو جاتی اور روزہ دار شامیانہ میں واپس آجاتے، معلوم ہوا کہ سبھی ڈنر پیکٹ ختم ہو چکے تھے۔ بھوکے پیاسے روزہ دار شاہنواز اور بی جے پی کو صلواتیں سناتے ہوئے گھروں کو روانہ ہوئے۔

دارالحکومت دہلی میں ۲۰۱۴ء میں وزیراعظم نریندر مودی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے ہی اس ماہ کی رونقیں چھن گئی ہیں۔ مودی کی دہلی آمد کے فوراً بعد ہی دارالحکومت میں افطار پارٹیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ چونکہ انہوں نے اپنے وزراء کو بھی پارٹیوں میں شامل ہونے سے منع کر دیا، اس لیے دیگر سماجی تنظیموں نے بھی آہستہ آہستہ افطار پارٹیوں کے انعقاد سے ہاتھ کھینچ لیے۔

افطار پارٹیوں کو سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانے پر بحث کی گنجائش تو ہے، مگر بھارت جیسے تکثیری معاشرہ میں یہ دیگر مذاہب یا طبقوں تک پہنچنے کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ ایک منظّم اور پُر وقار ماحول میں روزہ کھولنا اور نمازِ مغرب کی صف بندی اور خاص و عام کا کندھے سے کندھا ملانا، کہیں نہ کہیں ایک پیغام کا کام ضرور کرتا تھا۔

کشمیر میں بھی چونکہ افطار پارٹیوں کا کوئی رواج نہیں تھا، اس لیے دہلی آمد کے بعد یہ میرے لیے بھی ایک نیا تجربہ تھا۔ کشمیر میں تو زمانۂ امن میں بھی افطار سے قبل ایک طرح سے کرفیو سا لگتا تھا۔ مارکیٹ سنسان ہو جاتی تھیں۔ لوگ عام طور پر اپنے گھروں یا مقامی مساجد میں ہی روزہ کھولنے کو ترجیح دیتے تھے۔

افطار کا بھی الگ سے کوئی اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ جلد ہی نماز ادا کرنے کے بعد لوگ ڈنر کرتے تھے۔ اس ماہ کے دوران تقریباً سبھی سرگرمیاں اور روابط ماند پڑ جاتے تھے۔

اپنے دور طالب علمی میں ہی ۹۰ کے اوائل میں مجھے پہلی بار سابق وزیر اور کیرالہ صوبہ کے موجودہ گورنر عارف محمد خان

کی رہائش گاہ پر افطار پارٹی میں شرکت کا موقع ملا۔

دوران طالب علمی ان کی ایک قریبی رشتہ دار نے دعوت نامہ دے کر آنے کی تاکید کی تھی۔ افطار پارٹی کیا تھی، بس ایک عالیشان شادی کا سا سماں تھا۔ جن سیاسی وسماجی چہروں کو ٹی وی یا اخباروں میں دیکھتے آرہے تھے، وہ گوشت پوست کے ساتھ الگ الگ میزوں پر براجمان تھے۔

وزیر اعظم سمیت سبھی مرکزی وزراء، بالی ووڈ کے نامور اداکار وغیرہ موجود تھے۔ اس پارٹی میں میری پہلی بار مرحوم مفتی محمد سعید سے ملاقات ہوئی۔ گوکہ سوپور میں کئی بار پبلک جلسوں میں ان کی تقاریر سننے کا موقع ملتا تھا، مگر بالمشافہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ابھی حال تک بھارت کے وزیر داخلہ رہ چکے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ خاصا تام جھام تھا۔

کشمیری ہونے کی حیثیت سے بھی میں ان کو گہرے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ میں ان کو بھارتی ایجنسیوں کا پروردہ، جس کو کشمیری خواہشات کو کچلنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہو، سمجھتا آرہا تھا، جس نے ۱۹۷۷ء میں شیخ محمد عبداللہ کی حکومت کو گرایا اور بعد میں ۱۹۸۴ء میں دہلی کی ایما پر فاروق عبداللہ کو معزول کروایا اور جو کشمیر میں سیاسی بے چینی کا سبب بھی رہا۔

میری میزبان نے میرا ان سے تعارف کرایا تو انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شکایت کی کہ کشمیری مسلم نوجوان یا تو صحافت میں آتے ہی نہیں، یا کیریئر کے لیے دہلی کا رخ نہیں کرتے۔ انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ مجھ سے قبل یو این آئی کے شیخ منظور احمد اور سنڈے آبزرور کے ایڈیٹر محمد سعید ملک ہی بس دو ایسے کشمیری مسلمان ہیں، جنہوں نے دہلی میں صحافت میں کیریئر بنایا۔

انہوں نے کسی کو شیخ منظور، جو اُن دنوں یو این آئی نیوز ایجنسی میں سینئر پوزیشن میں کام کرتے تھے، کو ڈھونڈنے کے لیے کہا۔ منظور صاحب پر نظر پڑتے ہی انہوں نے مجھے ان سے متعارف کروا کر ان کو صلاح دی کہ وہ میرا خیال رکھیں۔ مجھے بھی مشورہ دیا کہ کشمیر واپس جانے کے بجائے دہلی ہی میں جرنلزم میں جگہ بناؤں اور منظور صاحب اور ملک صاحب سے مشورہ لیتا رہوں۔

گوکہ مودی نے آتے ہی وزیر اعظم ہاؤس میں افطار کا سلسلہ تو بند کروا دیا، مگر صدر پرنب مکھرجی نے صدارتی محل میں اس کو موقوف نہیں کیا تھا۔ ۲۰۱۷ء تک اپنی مدت صدارت ختم ہونے تک انہوں نے اس سلسلہ کو جاری رکھا۔

تمام ممالک کے سفیر، اپوزیشن رہنما و دیگر افراد اس میں شرکت تو کرتے تھے، مگر پروٹوکول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مودی نے کبھی بھی اس میں شرکت نہیں کی۔ ایک یا دو وزیر حکومت کی نمائندگی کرنے پہنچ جاتے تھے، جو صدر کی ہال میں آمد پر ان کا استقبال کر کے فوراً ہی رخصت ہو جاتے تھے کہ کہیں دیگر مہمانوں سے ملنے جلنے کے دوران ان کی فوٹو ریکارڈ پر نہ آجائے۔

راشٹر پتی بھون میں ایک بار افطار پارٹی کے بعد مغرب کی اذان تو ہوئی، مگر نماز کے لیے امام کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ وسیع وعریض صدارتی اسٹیٹ کے احاطہ میں ایک مسجد موجود ہے۔ اسی مسجد کے یا پارلیمان کے بغل میں جامع مسجد نئی دہلی کے امام صاحبان اس موقع پر امامت کرتے تھے۔

مگر دونوں اس دن غائب تھے۔ معلوم ہوا کہ نئی دہلی کی جامع مسجد کے امام محبّ اللہ ندوی جو اَب خیر سے رام پور سے لوک سبھا کے منتخب ممبر ہیں، دیر سے آنے کی وجہ سے باہر سیکورٹی کے اہلکاروں سے الجھے ہوئے تھے۔

اس دوران تمام مسلم ممالک کے سفیر، اراکین پارلیمان ودیگر زعما صفوں میں کھڑے امام کو تلاش کر رہے تھے۔ راجیہ سبھا میں لیڈر آف اپوزیشن غلام نبی آزاد اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ پاکستانی سفیر عبدالباسط نے آگے بڑھ کر امامت کا منصب سنبھال کر نماز ادا کروائی۔

اس دن معلوم ہوا کہ باسط صاحب ایک خوش الحان قاری بھی ہیں۔ ایک روح پرور منظر تھا کہ تمام دنیا کے مسلم ممالک کے سفیر اور بھارتی مسلم زعما، اشرافیہ اور مسلم اراکین پارلیمان ایک پاکستانی سفیر کی اقتدا میں نماز ادا کر رہے تھے۔

اسی طرح ایک بار صدارتی محل ہی میں وزیر اعظم من موہن سنگھ کی دوسری مدت حکومت میں مرکزی وزیر فاروق عبداللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ یہاں اس تقریب میں ہم دو کے علاوہ کوئی اور روزہ دار نہیں لگ رہا ہے، افطار کا وقت ہو رہا ہے، اس لیے ہم ڈنر ہال کے گیٹ کے پاس بیٹھ کر فوراً ہی اندر چلے جاتے ہیں۔

صدر وسیع وعریض اشوکا ہال میں آکر سبھی مہمانوں سے ایک ایک کر کے مل رہے تھے، فاروق صاحب سمجھا رہے تھے کہ ہم افطار کرنے آئے ہیں، دیگر افراد کی طرح صدر سے ملنے نہیں آئے ہیں۔ شاید راشٹر پتی بھون کے بیرے بھی ہمیں دیکھ کر تاسف کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے آکر ہمیں تسلی دی کہ افطاری میں خاصے لوازمات وافر مقدار میں ہیں۔

وہ یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ندیدوں کی طرح دروازے پر پہرہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، افطار کے وقت ناشتہ وغیرہ مل ہی جائے گا۔ میں نے فاروق صاحب سے پوچھا کہ ان کی رنگیلی طبیعت اور امیج کے برعکس وہ آج کل مومن کیسے ہو گئے ہیں؟ ان کا کہنا تھا کہ ماہ رمضان میں وہ سبھی دنیاوی کام چھوڑ کر روزوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور ختم قرآن شریف بھی کرتے ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ یہ ان کی ماں اکبر جہاں کا اعجاز ہے کہ وہ ان کو اور دیگر بھائیوں اور بہنوں کو روزہ اور تلاوت قرآن کی تاکید کرتی تھیں۔ اپنے باپ شیخ محمد عبداللہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتا رہے تھے کہ وہ بہت ہی سخت گیر قسم کے والد تھے اور اکثر ان کو چھڑی سے پیٹتے تھے، پر والدہ ہی ان کو چھڑاتی تھیں۔

بیگم اکبر جہاں، ایک نومسلم انگریز جان نیڈو اور ایک کشمیری گوجر لڑکی کی اولاد تھی۔ مگر سخت مذہبی اور صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھیں۔ فاروق صاحب نے کہا کہ اپنی والدہ کی یاد میں وہ رمضان میں روزہ ونماز کا سختی کے ساتھ اہتمام کرتے ہیں۔

من موہن سنگھ کی وزارتِ عظمٰی کے دور میں وزیر اعظم ہاؤس میں افطار پارٹی کے موقع پر دیکھا کہ چند مسلم زعما نے وزیر اعظم اور سونیا گاندھی کو گھیرا ہوا تھا، وہ سوال کر رہے تھے کہ حکومت کی طرف سے چند سال قبل مسلمانوں سے متعلق سچر کمیٹی کی سفارشات کو منظور کرنے کے باوجود عملی اقدامات کیوں نہیں اٹھائے جا رہے ہیں؟

پبلک سیکٹر بینک مسلم تاجروں یا اسٹارٹ اپ کو قرضے دینے سے لیت ولعل سے کام لیتے ہیں۔ میں انہی دنوں میرٹھ کسی اسٹوری کے سلسلے میں گیا تھا اور وہاں ہاشم پورہ محلّہ کے ۱۹۸۹ء کے فسادات کے متاثرین سے ملنے پہنچا۔ فسادات کے متاثرین میں ایک ڈاکٹر جو دماغی توازن کھو بیٹھے تھے، ٹھیک ہو کر بزنس کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کی میڈیکل لائسنس کینسل کر دی گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومتی اعلانات کے باوجود، کوئی بھی بینک لون نہیں دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے ایک پرنٹنگ پریس میں گفتگو کر رہے تھے۔

میں نے پوچھا کہ یہ پریس پھر کیسے وجود میں آیا؟ تو انہوں نے کہا کہ سال بھر قبل ادھر چوک میں ایک کشمیری بینک کھلا۔ جب میں نے وہاں درخواست دی، تو انہوں نے فوراً منظور کی۔ معلوم ہوا کہ جموں وکشمیر بینک، جو بھارت کا پبلک سیکٹر کا چوتھا بڑا بینک تھا، اس کی شاخ کھل گئی تھی۔ اس سے میرے دماغ کی بتی جیسے روشن ہو گئی۔

وزیر اعظم کے ساتھ اس گروپ کی تکرار سنتے ہوئے، میں نے وہیں کھڑے کھڑے ہی مشورہ دیا کہ بینکوں کے اس رویہ کا حل بس یہ ہے کہ جموں وکشمیر بینک کو ترغیب دی جائے

کہ مسلم علاقوں میں زیادہ سے زیادہ اپنی شاخیں کھولے۔

من موہن سنگھ نے کہا کہ ابھی افطار کا وقت ہو رہا ہے۔ ڈنر کے بعد چند منٹ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ ان زعما کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ پر میں نے ان سے کہا کہ اس وقت ملنے کے بجائے ان سے باضابطہ اپائنٹمنٹ لے کر تیاری کے ساتھ میٹنگ کا بندوبست کرو۔ ہو سکے تو سچر کمیٹی کے افسران ظفر محمود اور ابو صالح شریف کو اپنے ساتھ وفد میں لے کر ملاقات کا بندوبست کرو۔ وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، چونکہ اُن کو معلوم ہوگا کہ ملاقات کا ایجنڈا کیا ہے، وہ کابینہ سیکرٹری یا کم سے کم فنانس سیکرٹری کو بھی بلائیں گے اور ہاتھوں ہاتھ آپ کے مسائل حل ہو جائیں گے۔

مگر کون سنتا۔ خیر ڈنر کے بعد لان کے متصل کمرے میں ان زعما کو بلایا گیا۔ چونکہ جس وقت انہوں نے وزیر اعظم کو گھیرا ہوا تھا، میں بھی موجود تھا، اس لیے گھیر کر مجھے بھی ان کے ساتھ ہی لے جایا گیا۔ وزیر اعظم کے سیٹ پر بیٹھتے ہی، بجائے ان سے سچر کمیٹی کی سفارشات پر گفتگو کی جاتی، لکھنؤ سے آئے ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ حال ہی میں بھارت نے کیوں انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی میں ایران کے خلاف ووٹنگ کی؟

اس معاملہ کو لے کر انہوں نے خوب تقریر جھاڑی۔ مجھے بس اتنا سنائی دیا کہ من موہن سنگھ نے کہا کہ اس میں ملک کا مفاد تھا، اس پر وہ کوئی اور گفتگو نہیں کریں گے۔ لگا کہ اب اپنے مسائل پر یہ زعما بات کریں گے کہ ایک کونے سے ایک اور صاحب نے میانمار میں روہنگیا مسلمانوں پر ہو رہے ظلم کا ایشو اٹھایا اور سوال کیا کہ ان کی حکومت اس پر کیوں خاموش ہے۔

دس منٹ کی یہ میٹنگ اسی غیر سنجیدگی اور خارجہ پالیسی سے متعلق تقریروں کے ساتھ ختم ہوگئی۔ جس کے لیے یہ میٹنگ منعقد کی گئی تھی، وہ ایشو ہی نہیں اٹھائے گئے۔ اس واردات سے پرے افطار پارٹیاں یقیناً حکمرانوں کے ساتھ ایک کھلے اور باوقار ماحول میں براہ راست ملنے کا موقع فراہم کرتی تھیں۔

بتایا جاتا ہے کہ ۷۰ کی دہائی کے اواخر میں سوشلسٹ لیڈر ہیم وتی نندن بہوگنا نے مسلمانوں میں سیاسی آؤٹ ریچ کے لیے افطار پارٹیوں کے سلسلہ کو شروع کیا تھا، جس کو بعد میں اندرا گاندھی اور دیگر سیاسی پارٹیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

سابق وزرائے اعظم اٹل بہاری واجپائی اور من موہن سنگھ، جن کی حکومت حلیف پارٹیوں کی بیساکھیوں پر ٹکی ہوئی تھی، کے دور میں یہ افطار پارٹیاں پس پردہ سیاسی سرگرمیوں اور ناراض حلیفوں کو منانے کے کام بھی آتی تھیں۔ وزیر اعظم مودی اور ان کے دست راست وزیر داخلہ امیت شاہ نے جس طرح انتہائی کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کو ایک طرح سے سیاسی اچھوت بنا کر رکھ دیا ہے، افطار پارٹیوں کا خاتمہ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ حال اب یہ ہے کہ سیکولر پارٹیاں بھی اپنے حامیوں کو مشورہ دیتی ہیں کہ تزک و احتشام کے ساتھ افطار پارٹیوں کا اہتمام نہ کیا جائے۔

اگر ذاتی طور پر کوئی مقامی لیڈر افطار کا اہتمام کرتا ہے تو رہنماؤں کی تصویر یا پارٹی کا بینر آویزاں نہیں ہونا چاہیے۔ چند سال قبل اتر پردیش میں سماج وادی پارٹی نے رہنماؤں کو ہدایات دی تھیں کہ اگر کسی کی افطار پارٹی میں جانا ہو تو وہاں ٹوپی لگا کر سیلفی یا تصویریں نہ کھنچیں یا کم از کم ان کو سوشل میڈیا کی زینت نہ بنائیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جہاں سیکولر پارٹیاں افطار پارٹیوں سے دور بھاگتی نظر آئیں، وہیں دوسری طرف ہندو قوم پرستوں کی مربی تنظیم آر ایس ایس کی شاخ مسلم راشٹریہ منچ پچھلے سالوں سے کئی شہروں میں مسلمانوں کے لیے افطاری کا بندوبست کرتی ہے۔ اس سال تو دہلی میں اسرائیلی سفارت خانہ نے بھی افطار پارٹی منعقد کی۔ پتا نہیں کہ اس میں شامل مسلمانوں نے اسرائیلی سفیر کو فلسطین اور غزہ پر مسلط جنگ کے حوالے سے اپنے تحفظات سے آگاہ کیا یا بس شکم بھر کر ہی واپس لوٹے۔

خیر بھارت میں اس نئے رجحان کے تناظر میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا مسلمانوں کو واقعی سیاسی اچھوت بنایا گیا ہے اور کیا جو پارٹیاں مسلمانوں کے حقوق یا ان کی تقریبات میں شرکت کریں گی، ان کو ووٹ نہیں ملیں گے۔ بی جے پی نے تو مسلمانوں کو چھوڑ دیا ہے، مگر اب بیشتر سیاسی پارٹیوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اگر وہ مسلمانوں کے قریب نظر آتی ہیں، تو انہیں ہندو اکثریتی طبقے کا ووٹ نہیں ملے گا۔

تجزیہ کاروں کے مطابق مسلمانوں کے لیے اتنا بُرا وقت پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ تقسیم کے موقع پر بھی نہیں۔ گو کہ دنیا میں مسلمانوں کی جو آبادی ہے، اس کا دسواں حصہ بھارت میں ہے، مگر اس کے باوجود وہ سیاسی یتیم بنا دیے گئے ہیں۔

اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اسلام جو کہ ایک آفاقی سماجی نظام کا نقیب بن کر دنیا میں آیا تھا۔ اس کے ماننے والوں نے بھارت میں کبھی بھی صدیوں سے دبے کچلے مظلوم طبقوں کے ساتھ اتحاد بنانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اپنی حکومت اور طاقت کا استعمال کر کے ان طبقوں کو وسائل مہیا کرائے۔

(بحوالہ: ”دی وائر اردو ڈاٹ کام“۔ ۱۹/ مارچ ۲۰۲۵ء)

بقیہ: یورپ اور امریکا کی الگ ہوتی راہیں

یورپ کے لیے ایک بار پھر وہی کیفیت پیدا ہو چکی ہے جو دو عالمی جنگوں کی ابتدا کے وقت تھی۔ سیاسی تبدیلیوں سے گریز نے یورپ کو ہمیشہ الجھنوں سے دوچار رکھا ہے۔ امریکا کو یورپ کی ضرورت تھی، اس لیے اُس نے یورپ کو خوب استعمال کیا۔ اب اس کی گنجائش بھی ختم ہو چکی ہے۔ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ باقی دنیا بہت مضبوط ہو چکی ہے۔ امریکا تنِ تنہا پوری دنیا پر حکمرانی نہیں کر سکتا۔ یورپ کو ساتھ لیے بغیر چلنا اُس کے لیے ممکن نہیں مگر یورپ اپنی الگ راہ نکالنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ایسے میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یورپی اقوام کی قیادت کیا چاہتی ہیں اور کیا کر گزریں گی۔ امریکا خود کو الگ تھلگ بھی رکھنا چاہتا ہے اور یورپ پر اپنا حکم بھی تھوپنا چاہتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں کوئی ایک غلط فیصلہ بہت بڑی جنگ شروع کر سکتا ہے۔ یہ وقت ہر معاملے میں غیر معمولی احتیاط برتنے کا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بڑے پیمانے کی جنگی تیاریاں کر رکھنے کا بھی یہی وقت ہے۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Europe doesn’t need Trump to form a western alliance – and one is already taking shape".
("The Guardian". March 20, 2025)

* * *

بقیہ: ایشیا شدید عدم توازن کی زد میں

والے خطرات کے حوالے سے بہت حساس ہوتی ہیں۔ امریکا کے سامنے سب سے بڑا چیلنج چین کے اثرات کو کم سے کم سطح پر رکھنا ہے۔ اس مقصد کا حصول یقینی بنانے کے لیے وہ متعدد ایشیائی ریاستوں سے مل کر کام کرنے کو ترجیح دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایشیا میں امریکا کے اتحادیوں کی تعداد فی الحال کم نہیں ہونے والی۔ امریکا کسی بھی حال میں چین کو ایشیا کی سطح پر مکمل بالادستی کا حامل دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے لیے اُسے ایشیا میں پارٹنرز کی ضرورت تو لازمی طور پر پڑے گی۔ جو ممالک چین کے زیرِ اثر رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں، وہ امریکا سے ہاتھ ملانے اور اُس کے ساتھ کام کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔

اسٹیفن والٹ ہارورڈ یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کے رابرٹ اینڈ رینی بیلفر پروفیسر اور امریکی جریدے فارن پالیسی کے کالم نگار ہیں۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Asia is getting dangerously unbalanced".
("Foreign Policy". April 1st, 2025)

* * *

لبرل اِزم کی بقا کا سوال

John West

امریکا اور یورپ کو اس وقت سب سے بڑا چیلنج ایشیا سے درپیش ہے۔ تین دہائیوں سے یہ بات ہو رہی ہے کہ اکیسویں صدی ایشیا کی ہوگی یعنی ایشیا عالمی سیاست و معیشت اور تزویراتی امور کا مرکز بن کر ابھرے گا۔ امریکا اور یورپ کو اپنی برتری کے ساتھ ساتھ طرزِ فکر و عمل کی بھی فکر لاحق ہے۔ ان دونوں خطوں نے مل کر ڈھائی تین صدیوں کے دوران لبرل اِزم کو فروغ دیا ہے۔ لبرل اِزم یعنی ہر سطح پر آزادی کے تصور کی تعمیل۔ ویسے عمومی سطح پر لبرل اِزم سے مراد ہے کائنات کے بے خالق ہونے کا تصور۔ مغرب کا انسان اِس تصور سے آزادی چاہتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہوسکتا ہے۔ اور اِس سے بھی بڑی بات یہ کہ انسان کو اپنے لیے معقول ترین طرزِ زندگی کے تعین کے لیے کسی بھی مافوق الفطرت ہستی سے ہدایات کی کوئی ضرورت نہیں۔

امریکا اور یورپ اپنے لبرل اِزم سے متصادم ہر حکومت اور طرزِ حکومت کو اِل لبرل کہتے ہیں۔ دونوں خِطّوں کو دنیا بھر میں اور بالخصوص ایشیا میں غیر لبرل حکومتوں کا سامنا ہے اور اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ امریکا اور یورپ کو اپنے گھر میں بھی لبرل اِزم سے بیزار افراد کا سامنا ہے۔

سرد جنگ کے زمانے میں معاملات خاصے سادہ تھے کیونکہ مغرب اور اشتراکی حکومتوں کے درمیان معاشی تعلقات بہت محدود پیمانے کے تھے۔ تب غیر اشتراکی حکومتیں اشتراکیت کے خلاف اپنی لڑائی میں مغرب سے جُڑی ہوئی تھیں۔

دُگنی توجہ درکار ہے!

آج ہم لبرل اور غیر لبرل حکومتوں والی دنیا میں جی رہے ہیں اور اِن دونوں کے درمیان بھی کئی رنگ پائے جاتے ہیں۔ امریکا کے علاوہ ہنگری جیسے یورپی ممالک میں لبرل اِزم کے خلاف اٹھنے والی آوازیں اور رجحانات انتہائی خطرناک ہیں۔ دنیا بھر کی غیر لبرل حکومتیں لبرل معاشروں میں کسی نہ کسی طور سرایت کر کے معاملات کو بگاڑ رہی ہیں۔

ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ لبرل اور غیر لبرل حکومتوں کے درمیان اچھے خاصے معاشی تعلقات بھی ہیں۔ علاوہ ازیں، لبرل اور غیر لبرل حکومتیں ماحول کے تحفظ، وباؤں کی روک تھام اور سائبر سیکورٹی سمیت بہت سے اہم عالمگیر معاملات پر اشتراکِ عمل بھی کر رہی ہیں۔

غیر لبرل حکومتیں عالمگیر سطح پر تسلیم شدہ اصولوں اور قوانین کی بنیاد پر قائم اور فعال عالمی نظام کو بگاڑنے پر بھی تُلی ہوئی ہیں اور سیاست و معیشت و مالیات کے معاملات کو غیر لبرل سمت میں لے جانا چاہتی ہیں۔

غیر لبرل اِزم کے لیے ردِ عمل

امریکا اور یورپ کو مل کر غیر لبرل اِزم کو جواب دیتے وقت بہت سے معاملات پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ آیئے، اِن معاملات کا جائزہ لیں۔

☆ مغربی ممالک کو ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیے کہ غیر لبرل حکومتیں اُن کی کسی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھاسکیں۔ یوکرین جنگ کے حوالے سے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ مغرب نے مل کر جواب دیا ہے۔ خیر، یہ اشتراکِ عمل نازک ہے اور ڈونلڈ ٹرمپ کی واپسی نے پریشان کن حد تک نازک بنا ڈالا ہے۔

☆ یہ خیال رکھنا ہے کہ غیر لبرل حکومتوں سے معاشی اور دوسرا کوئی اشتراکِ عمل اُنہیں مستحکم نہ کرے۔ چین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ایسی کوئی اور مثال نہیں ہونی چاہیے۔

مغربی دنیا کے لیے اقتصادی پابندیاں اہم ٹُول کا درجہ رکھتی ہیں۔ معاشی فوائد قومی سلامتی کی قیمت پر یقینی نہ بنائے جائیں۔ اس معاملے میں جرمنی ایک اچھی مثال ہے۔

☆ کسی بھی غیر لبرل ملک کے غلط اور خطرناک اسٹریٹجک اقدامات کو کسی بھی حال میں قبول اور برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ ڈھیل برتنے ہی پر روس کو یوکرین پر لشکر کشی کا حوصلہ ملا۔

امریکا نے چین کو بعض معاملات میں بہت کچھ کرنے دیا۔ بحیرۂ جنوبی چین میں چینی سرگرمیوں کی روک تھام کی گئی ہوتی تو چین کو آگے بڑھنے کا راستہ نہ ملتا۔ یوکرین کی جنگ کے دوران بھی یورپ اور امریکا کا ریسپانس خاصا سُست رفتار رہا ہے۔ دونوں کو یہ خوف تھا کہ یوکرین کو ہتھیار دینے میں تیزی دکھائی تو روس زیادہ جارحیت کی طرف جائے گا۔

☆ غیر لبرل ریاستوں کی طرف سے سائبر حملوں، ذہنی اثاثوں کی چوری، جاسوسی اور دیگر ڈھکی چھپی سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے کارپوریٹ سیکٹرز اور اشتراکِ عمل سمیت بہت سی سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

☆ غیر لبرل ریاستوں میں متبادل سیاسی نظام کی بنیاد ڈالنے اور اُسے پروان چڑھانے پر بھی متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ جنوبی کوریا، تائیوان، پولینڈ، چیک جمہوریہ اور دیگر ممالک میں مزدور انجمنوں، کلیسا کی تنظیموں اور طلبہ کے گروپوں کے ذریعے معاملات درست کرنے کی کوشش کی گئی۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ چین اور روس میں غیر لبرل حکومتوں نے ہر سیاسی متبادل کی راہ مسدود کر دی ہے۔

اپنے جابرانہ نظام کو جاری رکھنے کے لیے غیر لبرل حکومتیں مغرب پر حکومت کی تبدیلی کے حوالے سے سازشوں کا الزام عائد کرتی رہتی ہیں۔ ایسے میں کسی سیاسی متبادل کو پروان چڑھانے کی کوششوں سے مجتنب رہنے کی گنجائش برائے نام ہے۔

☆ لازم ہے کہ اصولوں کی بنیاد پر کام کرنے والے عالمی نظام کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے پر خاطر خواہ توجہ دی جائے۔ اِس نظام کو کمزور کرنے کی ہر کوشش کے خلاف بھرپور مزاحمت بھی لازم ہے۔ روس نے یوکرین کی سلامتی اور سالمیت داؤ پر لگائی۔ چین نے علاقائی ممالک کے لیے مشکلات کھڑی کی ہیں۔ لبرل دنیا کو یہ سب برداشت نہیں کرنا چاہیے۔

خیر، ٹرمپ کے پہلے عہدِ صدارت میں امریکا نے عالمی تجارتی تنظیم اور دیگر عالمی تنظیموں کی کارکردگی کو نقصان پہنچایا اور اُن پر اپنی مرضی تھوپی۔ یورپی ممالک کو بھی اپنے دفاع کے معاملے کو زیادہ سنجیدگی سے لینا چاہیے اور اِس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اشتراکِ عمل یقینی بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یورپی یونین کے ارکان کا دفاعی بجٹ میں حالیہ اضافہ خوش آئند ہے تاہم یہ ضرورت سے بہت کم ہے۔

☆ روسی صدر ولادیمیر پوٹن جیسے غیر لبرل لیڈرز کو مغربی دنیا کی خارجہ پالیسی (مثلاً نیٹو اور یورپی یونین) کے خلاف ویٹو کا اختیار نہیں ملنا چاہیے۔ اگر ۲۰۰۸ء میں یوکرین اور جارجیا کو معاہدہ شمالی بحرِ اوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کی غیر مشروط رکنیت پیش کی گئی ہوتی تو معاملات بہتر ہوتے۔ اِس کے بجائے پوٹن کو خوش کرنے کی خاطر ایک مبہم فارمولا پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں چین کی اُن کوششوں کا توڑ تلاش کرنا چاہیے جو تائیوان کو عالمی ادارہ صحت کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکنے سے متعلق ہیں۔

حاصل کلام

لبرل ممالک کی حدود میں غیر لبرل عناصر کی سرگرمیوں کا کنٹرول بہت اہم ہے مگر یہ آسان نہیں۔ سیاست اور میڈیا

\\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۱۵ //////

یورپ اور امریکا کی الگ ہوتی راہیں

Martin Kettle

ایک زمانے سے یورپ میں بہتر دفاعی صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اب برطانیہ، جرمنی اور فرانس نے مل کر معاہدۂ شمالی بحرِ اوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کو مضبوط بنانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس حوالے سے اقدامات بھی شروع کردیے ہیں۔ ان تینوں بڑے یورپی ممالک کا دفاعی صلاحیتوں کا معیار بلند کرنے پر متوجہ ہونا دراصل امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے مزاج کے ہاتھوں پریشان ہونے کے باعث ہے کیونکہ وہ اب تک ایسے کئی اشارے دے چکے ہیں کہ وہ ہر حال میں صرف امریکا کا مفاد دیکھیں گے اور کسی بھی وقت کچھ بھی کر گزریں گے۔

کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ بحرِ اوقیانوس سے جڑے ہوئے ممالک کوئی ایسا اتحاد قائم کریں گے جس میں امریکا شامل نہ ہو۔ اس وقت تو ایسا تصور بھی محال ہے۔ بہت کچھ ہے جو ہے تو سہی مگر اب کسی کام کا نہیں، متعلق نہیں۔ دوسرا بہت کچھ ہے جو اگرچہ ہمیں پسند نہ ہو مگر مجموعی حقیقت کا جُز ہے، اِس لیے ہمیں اُس کا وجود ماننا ہی پڑے گا۔

ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جس کے بارے میں کوئی بھی بات پورے یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔ اِس دنیا میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے اور ہو ہی رہا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات مفادات کے حوالے سے سوچ پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ہماری نسلیں بھی اب ایسے ہی غیر یقینی ماحول میں زندگی بسر کریں گی۔ ڈونلڈ ٹرمپ جیسے قائدین نے جھٹکوں اور صدموں کا ایک نیا نظام متعارف کرایا ہے۔ یہی اب ہماری نئی حقیقت ہے۔ یکساں مزاج رکھنے والے چند قائدین نے بڑی طاقتوں کو اپنے جال میں جکڑ لیا ہے۔

یوکرین میں جو کچھ ہوا ہے، اُس نے پورے یورپ کو پریشان کیا ہے۔ لازم ہو چکا تھا کہ ہر حال میں یوکرین کی مدد جاری رکھی جائے تاکہ روس کو مین لینڈ یورپ کی طرف بڑھنے سے روکا جاسکے۔ امریکا میں ڈونلڈ ٹرمپ کی دوبارہ آمد سے زیادہ یورپ کو یوکرین کے دفاع کی فکر لاحق تھی۔ امریکا کے بغیر یہ کام ممکن نہ تھا، اس لیے یورپ کے قائدین نے امریکی انتخابی سیاست کے بجائے یوکرین کو روس کے دباؤ سے نکالنے کو زیادہ توجہ کے لائق سمجھا۔ یورپ کے لیے ایک طرف یوکرین کے صدر وولودومیر زیلنسکی سے رابطہ لازم تھا اور دوسری طرف ڈونلڈ ٹرمپ سے بھی، تاکہ روس کو ایک خاص حد تک رکھنا ممکن ہوسکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب یورپ کو اندازہ ہو چکا ہے کہ یوکرین کو بچانے کے لیے اُنہیں خود کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ ڈونلڈ ٹرمپ کئی بار واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ وہ ہر حال میں صرف امریکا کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کو ترجیح دیں گے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کل کو امریکا یوکرین کے معاملے میں بالکل پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ سیکورٹی کا بوجھ اب یورپ کو خود ہی اٹھانا ہے۔

یورپ کے ہر ایجنڈے پر اب یوکرین کی مدد پہلا نکتہ ہے۔ ایک طرف تو یوکرین کو اسلحہ فراہم کرنا ہے تاکہ وہ جنگ کے مورچوں پر روس کو خاطر خواہ حد تک جواب دے سکے اور دوسری طرف یوکرین کی اقتصادی مدد بھی کرنی ہے تاکہ اُس کے عوام ڈھنگ سے جی سکیں۔ امریکا پیچھے ہٹ رہا ہے۔ یورپ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی پالیسیاں اب یورپ کی مدد کرنے والی نہیں مگر پھر بھی کسی نہ کسی حد تک امریکا کو گلے لگائے رکھنا یورپ کی مجبوری ہے۔ ہاں، یورپ اس معاملے میں آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔ وہ امریکا پر بہت زیادہ بھروسا کرنے کے موڈ میں نہیں اور اِس کی گنجائش بھی نہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ یورپ کی نازک صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک امریکا نے یورپ کی سیکورٹی کی ذمہ داری نبھائی ہے اور اِس کے عوض بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے۔ یوکرین جنگ نے بھی یورپ کے لیے امریکا کی اہمیت بڑھائی۔ امریکی قیادت کو اندازہ تھا کہ روس کا سامنا کرنے کی خواہش، لگن اور نیت یورپ میں نہیں پائی جاتی، اس لیے اُس نے یوکرین کو مضبوط رکھنے میں اہم کردار ادا کیا اور جہاں تک ہوسکا، یورپ سے اِس کی قیمت بھی وصول کی۔ اب امریکی قیادت یوکرین کی بھرپور حمایت اور مدد سے دست بردار ہوکر دراصل یورپ کو بلیک میل کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یوکرین جنگ میں اچھا خاصا نقصان اٹھانے کے باوجود روس اب بھی یورپ کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اور یورپی قائدین نہیں چاہیں گے کہ یوکرین جنگ سے امریکا خود کو مکمل طور پر لاتعلق کر لے۔

امریکا کا معاملہ یہ ہے کہ یورپ کے لیے اُس کی طاقت ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اُس پر بھروسا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یوکرین کے ہاتھ مضبوط کرکے اُسے روس کا راستہ روکنے کے قابل بھی بنانا ہے مگر اس کام سے اب امریکا کو دور رکھنا ہے کیونکہ وہ غیر اعلانیہ بلیک میلنگ پر اُترا ہوا ہے۔

یورپ کو بہت دیر سے ہی سہی مگر اب احساس ہوا ہے کہ ہر معاملے میں صرف امریکا پر مکمل بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ امریکا نے اپنی عسکری مہمات میں یورپ کو بہت بُری طرح استعمال کیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ اِس امر کی گواہ ہے۔ افغانستان اور عراق میں بھی یورپ کو استعمال کیا گیا۔ یورپ کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اپنے مؤثر دفاع کے لیے اُسے یا تو نیٹو کو بہت مضبوط کرکے اپنے حق میں استعمال کرنا پڑے گا یا پھر کوئی نیا سیاسی اور اسٹریٹجک اتحاد اِس طور تشکیل دینا پڑے گا کہ امریکا یا تو اُس میں شامل نہ ہو یا پھر اُس کی حیثیت نمائشی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نیا مغربی سیاسی اتحاد نیٹو کے بغیر ہو اور اِس میں امریکا نہ ہو بلکہ کینیڈا کی شمولیت یقینی بنائی جائے۔ امریکا نے یورپ کے ساتھ اب تک جو کچھ کیا ہے، اُس کی روشنی میں یورپی قائدین نہیں چاہتے کہ کسی بھی معاملے میں اب اُس پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کیا جائے۔ اگر ڈونلڈ ٹرمپ کسی نئے مغربی سیاسی اتحاد سے امریکا کو دور بھی رکھیں تو کوئی بات نہیں، نیٹو کا پلیٹ فارم تو موجود ہے۔

یورپی ریاستوں کی اندرونی سیاست بھی معاملات پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ جرمنی میں رجعت پسندی بڑھ رہی ہے۔ فرانس میں مرکز کی بالادستی چاہنے والی سیاسی قوتوں کا بول بالا ہے۔ برطانیہ میں اس وقت ایک ایسی فوج ہے جو نپولین کے بعد سے اب تک کے تمام زمانوں کی سب سے چھوٹی برطانوی دفاعی قوت ہے۔ بہرکیف، یورپ اس وقت فرانس، جرمنی اور برطانیہ کے ہاتھوں میں ہے اور یہ سب مل کر کوئی نہ کوئی معقول راہ نکال ہی سکتے ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے حال ہی میں روسی ہم منصب ولادیمیر پوٹن سے ۹۰ منٹ کی ٹیلی فونک گفتگو کی ہے۔ اس گفتگو کے حوالے سے بہت سی توقعات وابستہ کی گئی تھیں مگر ایسا کچھ بھی برآمد نہ ہوسکا جس سے کسی نہ کسی صورت حوصلہ افزائی ہو۔ یہ توقع تو خیر کوئی کر ہی نہیں سکتا کہ روسی صدر سے ٹرمپ کی گفتگو ہو اور یوکرین کے حق میں جانے والی کوئی بات کی جائے۔ یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ ٹرمپ اپنے روسی ہم منصب سے

کہیں کہ یوکرین میں جنگ روک دے۔ اِس جنگ ہی نے تو امریکا کی قیمت بڑھائی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے اب تک یوکرین جنگ کے حوالے سے اور روس سے تعلقات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اُس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ یوکرین کو روس کا حصہ گردانتے ہیں۔ روسی صدر نے اب تک ٹرمپ سے ہونے والی گفتگو میں جو کچھ کہا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے امریکی ہم منصب سے یہی کہتے ہیں کہ وہ ایک طرف ہٹ جائیں، یہ روس اور یوکرین کا معاملہ ہے۔ روسی قیادت چاہتی ہے کہ امریکا ایک طرف ہو جائے تا کہ یوکرین کے خلاف جنگ جیتنا اور اُسے روس کا حصہ بنانا آسان ہو جائے۔ یہی سبب ہے کہ روس نے ایک بار پھر یوکرین پر حملے تیز کر دیے ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ لاکھ دعویٰ کرتے پھریں کہ وہ یوکرین جنگ ختم کروانا چاہتے ہیں اور امن کے داعی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کے ہاتھوں خرابیاں بڑھ رہی ہیں۔ وہ امن قائم کرنے کے دعوے کے ساتھ ساتھ امریکی فوج کو ہٹانے اور یوکرین کی مالی امداد بھی کم کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ دنیا کو یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ امریکا اب یوکرین جنگ کو ختم کروانا چاہتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ روسی قیادت اس تبدیلی کا فائدہ اٹھا کر یوکرین پر دباؤ بڑھا رہی ہے اور یوں یورپ کے لیے خطرات بڑھ رہے ہیں۔ جب یورپ کے لیے خطرات بڑھیں گے تو اُسے امریکا کی زیادہ ضرورت پڑے گی اور یوں امریکی قیادت اپنی قیمت بڑھوانے میں کامیاب رہے گی۔ امن قائم کرنے کے نام پر امریکی صدر جو کچھ کر رہے ہیں، اُس کی توقع صرف اُن کے ذہن ہی سے کی جاسکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ یورپ کی سیکورٹی کی ذمہ داری سے سبکدوش کر کے امریکی فوج کو اندرونی معاملات کی طرف زیادہ متوجہ رکھنا چاہتے ہیں۔ علاقائی صورتحال کا تقاضا بھی یہ ہے کہ امریکی فوج یورپ جیسے دور افتادہ خطے کے بجائے امریکا کے پڑوسیوں پر زیادہ متوجہ رہے۔

جو کچھ امریکا کر رہا ہے، اُس کے نتیجے میں یورپ میں اندرونی سطح پر بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ جرمنی، فرانس اور برطانیہ کی سیاست میں ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جن کے نتیجے میں ایک طرف تو سیاسی اکھاڑ پچھاڑ ہوگی اور دوسری طرف امریکا کی طرف دیکھنے والوں کی تعداد میں کمی آئے گی۔ فرانس، جرمنی اور برطانیہ اسلحہ سازی میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر وہ یورپ کے دفاع کے بارے میں سنجیدہ ہوئے تو ایک طرف یوکرین کو مضبوط بنائیں گے اور دوسری طرف امریکا سے فاصلہ بڑھائیں گے۔ یورپ بھر میں بنیادی ڈھانچے کے منصوبوں کو زیادہ سے زیادہ فنڈنگ کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسلحہ سازی اور دفاعی ساز و سامان کی پیداوار کا گراف بھی بلند کرنا ہے۔ اگر یورپ اپنے دفاع کی ذمہ داری خود اٹھانا چاہتا ہے تو پھر اُسے اپنے اسلحہ ساز اداروں کو کام پر لگانا ہوگا۔ اِن اداروں کے ملازمین کو زیادہ سے زیادہ یعنی دن رات کام کرنا ہوگا۔ نئے لڑاکا طیاروں، میزائلوں، گولا بارود، بھاری مشین گنوں، اسنائپرز اور دیگر جنگی ساز و سامان کی تیاری بہت بڑے پیمانے پر یقینی بنانا ہوگی۔ جرمنی اسلحہ سازی میں تھوڑا پیچھے ہے۔ اُسے اس حوالے سے بھرپور طور پر متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے فنڈنگ بھی چاہیے اور عزم بھی۔ سیاسی عزم کے بغیر بھرپور دفاعی تیاری بہت مشکل ہوا کرتی ہے۔ جرمن سیاست دانوں کو اس حوالے سے اپنے آپس کے اختلافات ختم کر کے ایک پیج پر آنا ہوگا۔ جرمنی قرضے لینے سے گریز کرتا رہا ہے۔ اب یہ رکاوٹ دور ہوگئی ہے۔ ایک طرف معیشت کی نمو رک گئی ہے اور دوسری طرف روس کی طرف سے خطرات لاحق ہیں۔ ایسے میں جرمنی کے پاس مکمل طور پر متحرک ہونے کے سوا چارہ نہیں۔

ایک زمانے سے جرمنی میں سیاسی تفریق بہت زیادہ رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں ملک کے دفاعی معاملات میں فیصلہ سازی تاخیر کا شکار ہوتی رہی ہے۔ دائیں اور بائیں بازو والوں کے درمیان ملک کی دفاعی صلاحیت کو بڑھانے کے حوالے سے اختلافات رہے ہیں۔ معیشتی خرابیوں کے باعث دفاع کو مضبوط بنانے کے حوالے سے کیے جانے والے اقدامات کی حوصلہ افزائی کرنے والے کم رہے ہیں۔ بہت حد تک یہ کیفیت ابھی کچھ مدت پہلے تک تھی۔ اب چونکہ یوکرین کا معاملہ بہت نازک ہو چکا ہے اور روس کو مین لینڈ یورپ کی طرف بڑھنے سے روکنے کی کوششیں لازم ہیں، اس لیے امریکا کی طرف سے مایوس ہونے پر دیگر یورپی قوتوں کی طرف جرمنی میں بھی سیاسی قائدین اپنی سوچ بدلنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے فیصلوں کی ٹائمنگ بھی بہت اہم ہے۔ اگر روس کو روکنے سے متعلق کوششوں کے بارے میں فیصلے تاخیر سے کیے گئے تو بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جرمنی کو اس وقت بھی بہت سے معاشی مسائل کا سامنا ہے۔ افراطِ زر کی شرح بلند ہونے کا خطرہ بھی موجود ہے مگر مجموعی طور پر پورے یورپ کو لاحق خطرات کے تناظر میں یہ سب کچھ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر جرمنی، فرانس اور برطانیہ نے معاملات کو بھانپنے کی دیر کی یا غلطی کر بیٹھے تو روس کو روکنا بہت مشکل ہوگا۔ سوال روس کو فتح کرنے کا نہیں بلکہ اُس کے ہاتھوں رونما ہونے والی تباہی کو روکنے کا ہے۔

یورپ بہت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں آسٹرو ہنگیرین سلطنت کے خاتمے کے بعد سے یورپ کی غیر معمولی سیاسی اور اسٹریٹجک حیثیت رہی ہے۔ عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ جرمن سیاست دان نظریاتی طور پر روس کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اب اِس کی کچھ خاص گنجائش نہیں رہی کیونکہ روس نے یورپ کے لیے ایک بڑے خطرے کی شکل اختیار کر لی ہے اور یورپ میں تو خود جرمنی بھی آتا ہے! گیرہارڈ شروڈر اور اینجلا مرکل کے ادوارِ اقتدار میں جرمنی کا مجموعی طور پر روس کی طرف جھکاؤ رہا۔ اب اس کی گنجائش بالکل نہیں رہی۔ ولادیمیر پوٹن نے جو کچھ بھی یوکرین کے ساتھ کیا ہے اور یورپ کے ساتھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے جرمنی میں روس کو ہمدردی کی نظر سے دیکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ پہلے اولاف شوئلز کے دور میں اور اب مرز کے دور میں روس سے دوستی اور اشتراکِ عمل کے بارے میں سوچنا بھی محال ہے۔

جرمنی کسی بھی یورپی اتحاد کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ جرمنی کو نظر انداز کر کے کوئی بھی بڑا سیاسی اور اسٹریٹجک اتحاد نہ تو قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُسے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمنی یورپ کے قلب میں واقع ہونے کی بدولت کئی ریاستوں پر غیر معمولی اثرات کا حامل ہے اور اپنی تکنیکی برتری کی بدولت وہ پورے یورپ کی سیاسی اور عسکری حکمتِ عملی کے لیے غیر معمولی مقام کا حامل ہے۔ دو عالمی جنگوں میں جرمنی کو بہت کچھ سہنا پڑا تھا۔ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ کوئی اور عالمی جنگ ہوئی تو اُسے پھر تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا مگر اب شاید اُسے زیادہ نہ سہنا پڑے کیونکہ وہ اس بار یورپ کے خلاف نہیں ہوگا۔

یورپ بہت نازک موڑ پر ہے۔ اُسے اپنے بارے میں، اپنی بقا کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہے اور جلد کرنا ہے۔ بڑی یورپی طاقتوں کو ایک نیا سیاسی اور عسکری اتحاد تشکیل دینا ہی پڑے گا کیونکہ امریکا پر بہت زیادہ بھروسا کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنا پورا وزن پوٹن کے پلڑے میں ڈال دیا تو یورپ کی سلامتی ہی نہیں بقا بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

باقی صفحہ نمبر ۵

دہلی فسادات کے ۵ سال

مُعاوَضہ اور اِنصاف آج بھی بہت دُور

ہرش مندر

شمال مشرقی دہلی میں ہوئے فسادات کے پانچ سال بعد بھی سماجی تقسیم اور دوری ختم ہوئی ہے اور نہ ہی اس تشدد کے متاثرین کو مناسب معاوضہ ملا ہے۔ انصاف تو آج بھی دور کی کوڑی ہے۔

’میرے بھائی کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کو پانچ سال گزر چکے ہیں۔ پہلے انہوں نے اسے گولیوں سے بھون دیا۔ پھر انہوں نے اسے لاٹھیوں سے پیٹا۔ اور آخرکار آگ کے حوالے کر دیا۔‘

یہ بات دہلی میں کاروانِ محبت کے زیر اہتمام ۲۶ فروری کو منعقد یکجہتی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سلیم نے کہی:

شمال مشرقی دہلی کے مزدور طبقے کے علاقے میں ہوئے فرقہ وارانہ قتل عام کی پانچویں برسی کے موقع پر اس اجلاس کا انعقاد کیا گیا تھا، اس تشدد کی شروعات ۲۳ فروری ۲۰۲۰ء کو ہوئی تھی۔

سلیم نے مزید کہا، ’میں یہ سب کچھ پڑوس کی ایک عمارت کی تیسری منزل پر بیٹھ کر دیکھ رہا تھا۔‘ انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ’میں بے بس تھا۔ میں اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔‘

’میرا گھر، میرا کارخانہ، سب کچھ لوٹ لیا گیا۔ ہجوم نے ان عمارتوں پر پٹرول چھڑک کر آگ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے ہماری گاڑیاں بھی جلا دیں۔ ہمارا سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا۔ ہم اپنی جان بچانے کے لیے پولیس کو فون کرتے رہے لیکن کوئی نہیں آیا۔‘

’ہم صرف اپنے ہندو پڑوسی ابھیشیک کی وجہ سے زندہ ہیں۔ میں انہیں سلام پیش کرتا ہوں۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ انہوں نے میرے ماتھے پر تلک لگایا تاکہ میں ہندو جیسا نظر آؤں۔ وہ ہمارے خاندان کے تمام نو افراد کو اپنے گھر لے گئے۔‘

’کچھ دنوں بعد، جب تشدد کم ہوا تو میں پڑوسیوں کے ساتھ پولیس اسٹیشن گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے ہجوم کو میرے بھائی کو زندہ جلاتے ہوئے دیکھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا اور اگر وہ مر گیا ہے تو مجھے اس کی لاش چاہیے۔ پولیس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ تحقیقات کریں گے۔ انہوں نے مجھے اس جگہ سے فون کیا جہاں میں نے اپنے بھائی کو جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں اس کی لاش نہیں ملی۔ انہیں صرف ایک پیر ملا۔‘

انہوں نے مجھ سے پوچھا، ’کیا تم اس کے پیر کو پہچان سکتے ہو؟‘ میں نے ان سے کہا کہ ’ہم بچپن سے ساتھ رہے ہیں، مجھے یقین ہے کہ میں اس کے پیر کو پہچان لوں گا‘۔ اس رات میں جی ٹی بی اسپتال کے مردہ خانے میں گیا، جہاں انہوں نے مجھے پلاسٹک میں لپٹی ہوئی ٹانگ دکھائی۔ میں نے ان سے کہا، ’یہ میرا بھائی ہے‘۔ مجھے یقین تھا۔ میں اپنے بھائی کی باقیات واپس لینے ہر دوسرے دن اسپتال جاتا تھا۔ بالآخر ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد تصدیق ہوئی کہ ٹانگ واقعی میرے بھائی کی تھی۔ ایک سال بعد مجھے اس کی ٹانگ ملی۔

جب سلیم نے اپنے درد اور مایوسی کی داستان سنائی تو ہال میں بہت کم آنکھیں ایسی تھیں جو نم نہیں ہوئی تھیں۔

کاروانِ محبت کے اس اجلاس میں دوسرے متاثرین نے بھی اپنے درد کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک ممتاز بیگم تھیں، جو سسک رہی تھیں اور ٹھیک سے بول نہیں پا رہی تھیں۔ ان کے شوہر نے اپنے چھوٹے سے گھر کی کھڑکی سے باہر جھانکا ہی تھا کہ انہیں بھیڑ کی خوفناک دھاڑ سنائی پڑی۔ اسی وقت کسی نے ان کے چہرے پر کوئی مائع پھینک دیا۔ جو تیزاب نکلا۔ ڈاکٹروں نے دو سال تک ان کا علاج کیا، لیکن ان کی بینائی واپس نہیں آئی۔ تیزاب کی وجہ سے وہ مکمل طور پر نابینا ہو گئے۔ حملے سے پہلے وہ کریانے کی چھوٹی سی دکان چلاتے تھے۔ اب یہ خاندان بالکل بے سہارا ہو گیا ہے۔

ریحانہ بیگم نے ان تلخ سماجی فاصلوں کے بارے میں بات کی، جس کے باعث ان کا علاقہ الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا، ’پانچ سال پہلے ہونے والا تشدد اب تک ختم نہیں ہوا۔ تشدد جاری ہے۔ میں جس علاقے میں رہتی ہوں، وہاں لوگ اب بھی ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے ہم نے کسی کو قتل کیا ہو یا کسی کو لوٹ لیا ہو۔ فسادات کے بعد جب ہم گھر لوٹے تو لوگ ہماری طرف ایسے دیکھتے تھے جیسے ہم نے ان کے گھروں کو لوٹ لیا ہو۔ جب ایودھیا میں مندر کا افتتاح ہوا تو حالات اور بھی بدتر ہو گئے۔ پھر انہوں نے سڑکوں پر نعرے لگانے شروع کر دیے جس سے ہم بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔ ہم آج بھی اس ڈر کا سامنا کر رہے ہیں۔‘

لیکن سلیم جیسے کئی لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی جان ان کے ہندو پڑوسیوں نے بچائی۔ شہزاد اصغر زیدی کی ایک دکان تھی۔ ان کی پانچ بیٹیاں ہیں اور بیٹا کوئی نہیں، دکان سے انہیں اچھی کمائی ہو جاتی تھی۔ فسادات کے دن ایک ہندو پڑوسی نے انہیں بتایا کہ ہجوم نے ان کی دکان کو آگ لگا دی ہے۔ وہ دور سے بے بسی سے دیکھتے رہے۔ ایک دن بعد وہ ملبے میں کچھ اہم دستاویزوں کی تلاش میں دکان پر گئے۔ وہاں ایک شخص نے ان پر چاقو سے حملہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک ہندو دوڑ کر ان کے درمیان کھڑا ہو گیا اور کہا کہ وہ شہزاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔ ’جس آدمی نے مجھے مارنے کی کوشش کی وہ ہندو تھا جس نے مجھے بچایا، وہ بھی ہندو تھا۔ میں کیا کہوں؟‘

اس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا، زیدی اسے انصاف اور معاوضے کے لیے اپنی ’دوسری جنگ‘ کی طرح دیکھتے ہیں۔ کسی کو ان کی دکان لوٹنے اور جلانے کی سزا نہیں دی گئی۔ حالانکہ ان کا نقصان پانچ یا چھ لاکھ روپے کا تھا، لیکن مسلسل حکومت کے دروازے کھٹکھٹانے کے بعد انہیں صرف پانچ ہزار روپے بطور معاوضہ دیا گیا۔

موج پور چوک پر استعمال شدہ کپڑوں کی دو منزلہ دکان چلانے والے رفیق کا ہاتھ پانچ سال بعد بھی خالی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ۲۳ فروری کو بی جے پی لیڈر کپل مشرا کی نفرت انگیز تقریر کے فوراً بعد لوٹ مار، آتش زنی اور پتھراؤ شروع ہو گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگے۔ کسی طرح وہ تنگ گلیوں سے دوڑتے ہوئے گھر پہنچے۔ چار دن بعد ان کے پڑوسیوں نے انہیں اطلاع دی کہ گیس سلنڈر پھوڑ کر ان کی دکان جلا دی گئی۔ پھر بھی انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔

محمد شہزاد کے پاس ایک ’دھرم کانٹا‘ تھا، جس میں ٹرک جیسی بھاری گاڑیوں کا وزن کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ۱۵ سے ۲۰ ملازموں کو کام پر رکھا ہوا تھا، جن میں اکثر ہندو تھے۔ ایک ہندو ملازم نے گھبراہٹ میں انہیں فون کیا اور بتایا کہ ایک مشتعل، نعرہ بازی کرنے والا ہجوم جمع ہو گیا ہے اور ترازو کو آگ لگا رہا ہے۔ شہزاد نے پولیس کو فون کیا۔ دوسری طرف موجود شخص نے انہیں یقین دلایا کہ وہ جلد اپنی فورس بھیج دیں گے۔ پھر اس نے شہزادے کا نام پوچھا۔

صاف تھا کہ فون کرنے والا مسلمان تھا۔ ہجوم کو منتشر کرنے یا آگ بجھانے کے لیے کوئی پولیس فورس وقت پر نہیں پہنچی۔ ان کے ملازم نے بعد میں انہیں بتایا کہ جب پولیس پہنچی تو بہت

زیادہ تباہی ہو چکی تھی، لیکن انہوں نے ہجوم کو توڑ پھوڑ اور آتش زنی جاری رکھنے کی ترغیب دی۔ ہجوم نے ترازو کے قریب کھڑی گاڑیوں کو بھی آگ لگا دی، اور ایک ملازم کو تقریباً مار ڈالا۔

جب یہ سب ہو رہا تھا تب شہزادا اپنے گھر والوں کے ساتھ گھر میں چھپا ہوا تھا۔ وہاں بھی ایک بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا، اور اتنے پتھر اور اینٹیں پھینکیں کہ جلد ہی فرش نظر نہیں آ رہا تھا، اس کے بعد انہوں نے کئی ہفتوں تک پولیس کا پیچھا کیا، لیکن انہوں نے مجرموں کو گرفتار نہیں کیا۔ بلکہ پولیس انہیں دھمکیاں دیتی رہی۔

شہزاد نے بتایا کہ ان کے والد ایک غریب مزدور تھے اور کم عمری میں ہی انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنا کاروبار کھڑا کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی۔ اب سب کچھ برباد ہو چکا ہے۔ انہیں کروڑوں کا نقصان ہوا ہے۔ انہیں جو معاوضہ ملا ہے، وہ صرف ساڑھے ۱۲؍ہزار روپے ہے۔

فیضان کی عمر صرف ۱۴؍سال تھی، جب فرقہ وارانہ تشدد کے دوران اچانک گولی لگنے سے اس کی زندگی بدل گئی۔ ان کی والدہ کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ان کے والد نے انہیں اور ان کے بھائی کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کی دادی نے ان کی پرورش کی۔ تشدد کے دوسرے دن، ان کی دادی نے انہیں اپنی گلی میں ایک دکان سے کچھ کھانا خریدنے کے لیے بھیجا۔ اسی وقت ایک پرتشدد ہجوم محلے میں داخل ہوا، فیضان خوفزدہ ہو کر بھاگا لیکن ایک گولی اسے لگ گئی اور وہ نیچے گر پڑا۔ پڑوسی انہیں کلینک لے گئے۔ ان کی کمر پر گولی کے گہرے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ کلینک کے ڈاکٹر نے زخم پر پٹی تو باندھ دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر اس کی جان بچانی ہے تو اسے فوراً اسپتال لے جانا پڑے گا۔ لیکن یہ ناممکن لگ رہا تھا۔ ہر طرف ہجوم تھا، پتھر برسائے جا رہے تھے، عمارتوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ کسی گاڑی، ایمبولینس کو آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ایک رحم دل صحافی نکیتا جین نے ان کی جان بچائی۔ ان کے پڑوسیوں کی مدد سے انہوں نے انہیں لکڑی کی ایک گاڑی پر لٹایا اور چادر سے ڈھانپ دیا۔ بھیڑ کے درمیان سے ہوتے ہوئے وہ اس گاڑی کو پولیس جیپ تک لے گئے۔ وہاں صحافی نے پولیس والوں سے درخواست کی کہ وہ انہیں اسپتال لے جائیں۔ پولیس شروع میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہی تھی لیکن آخرکار مان گئی، لیکن جب وہ انہیں اسپتال لے جا رہے تھے، فیضان کو یاد ہے کہ وہ ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انہوں نے کہا، ’باہر جا کر دوبارہ احتجاج کرو۔ تمہارے ساتھ یہی ہوگا۔ تمہیں وہی ملا ہے جس کے تم مستحق ہو۔‘

سال ۱۹۶۱ء میں جبل پور میں آزادی کے بعد ہوئے پہلے بڑے فسادات کے بعد سے ہی بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ تشدد کے متاثرین کو انصاف اور معاوضہ دلانے میں، ایک آدھ معاملے کو چھوڑ کر، ہندوستانی حکومتوں کا ریکارڈ بری طرح سے داغدار ہے۔ لیکن ان شرمناک مثالوں سے قطع نظر شمال مشرقی دہلی کا فرقہ وارانہ قتل عام بالکل الگ ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تشدد قومی راجدھانی میں ہوا، جہاں سے ملک اور دہلی کی حکومتیں چلتی ہیں۔ دہلی تمام مسلح افواج اور بیشتر نیم فوجی دستوں کا قومی ہیڈ کوارٹر ہے۔ اگر نیت ہوتی تو شہر کے مزدور طبقے کے علاقے میں شروع ہونے والی معمولی جھڑپوں پر چند گھنٹوں میں قابو پایا جا سکتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ چھ دن تک بلاتعطل جاری رہا، یہ نہ صرف ریاست کی ناکامی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ یہ مجرموں اور ریاست کی ملی بھگت کا ثبوت بھی ہے۔ تشدد لمبے وقت تک صرف اس لیے جاری رہا کہ ریاست اس کو جاری رکھنا چاہتی تھی۔

بی جے پی کے سرکردہ لیڈروں کی نفرت انگیز تقاریر کے باوجود، اور دہلی ہائی کورٹ میں ہماری مداخلت اور قائم مقام چیف جسٹس مرلی دھر کی سخت سرزنش کے باوجود، پولیس نے ان میں سے کسی کے خلاف مقدمہ درج کرنے سے انکار کر دیا۔ ’دیش کے غداروں کو‘ گولی مارنے کی اپیل کرنے والوں میں سے ایک کو مرکزی کابینہ کا وزیر بنایا گیا۔ پانچ سال بعد دہلی حکومت میں دوسرے کو وزیر بنایا گیا، وہ بھی وزیر برائے قانون و انصاف۔

تشدد کو روکنے یا اس پر قابو پانے میں ناکام ہونے کے بعد، ریاست کا اگلا فرض ان لوگوں کی حفاظت کرنا تھا جن کی جانوں، املاک اور گھروں کو فسادی ہجوم نے نشانہ بنایا تھا۔ لیکن پولیس نے ان ۱۳؍ہزار فون کال کو نظرانداز کر دیا، جو اسے کی گئیں۔

ریاستی حکومت نے ۲۰۰۲ء میں گجرات حکومت کے شرمناک اقدام کی پیروی کرتے ہوئے ریلیف کیمپ قائم کرنے کے لیے شروع میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ جب اس کی بڑے پیمانے پر تنقید کی گئی تو دہلی حکومت نے نو بے گھر پناہ گاہوں کو ریلیف کیمپ کے طور پر نامزد کیا۔ یہ تشدد سے بے گھر ہونے والے ہزاروں لوگوں کی توہین کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بے گھر پناہ گاہیں خالی ٹین شیڈ ہیں جن میں بے گھر افراد کو غیر صحتمند اور غیر صحت بخش حالات میں، خاص طور پر سردیوں کے مہینوں میں پیک کر دیا جاتا ہے۔

یہ فرقہ وارانہ تشدد سے بے گھر ہونے والے ہزاروں لوگوں کے لیے حفاظت اور علاج و معالجے کی جگہیں کیسے ہو سکتی ہیں؟ قومی راجدھانی دہلی کے پاس اتنے وسائل تھے، جنہیں آسانی سے مثالی ریلیف کیمپوں کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا، جیسے کہ اسٹیڈیم اور کالج کی عمارتیں۔ لیکن حکومت نے فرقہ وارانہ تشدد کے شکار لوگوں کو مؤثر ریلیف فراہم کرنے کے لیے کوئی آپشن نہیں چنا۔

کاروانِ محبت کی رپورٹ میں بیان کی گئی معاوضے کی کہانی، جس کا عنوان ہے ’غیر حاضر ریاست: ۲۰۲۰ء کے دہلی فسادات کے متاثرین کو معاوضہ اور نقصان کی بھرپائی سے انکار‘، اس سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ مرکزی حکومت نے معاوضے کی اسکیم کا اعلان نہیں کیا اور تشدد کے متاثرین کو پانچ سالوں میں ایک روپیہ بھی نہیں دیا۔

ریاستی حکومت نے ایک اچھی شروعات کی، لیکن یہ صرف چند ہفتے ہی چل سکی۔ اس نے کم از کم معاوضے کی اسکیم کا اعلان کیا، حالانکہ ۱۹۸۴ء کے سکھ مخالف فسادات کے مقابلے میں یہ بہت محدود پیمانے پر تھا۔ ریاستی حکومت کے اہلکاروں نے موت کے معاوضے اور ایکس گریشیا کو مؤثر طریقے سے تقسیم کیا۔

لیکن جلد ہی، مارچ میں ہی، دہلی کی ریاستی حکومت نے معاوضے کا اندازہ لگانے اور تقسیم کرنے کے لیے ایک علیحدہ ایجنسی قائم کرنے کے لیے دہلی ہائی کورٹ سے رجوع کیا۔ یہ ناقابل فہم اور ناقابل معافی تھا، کیونکہ فرقہ وارانہ اور نسلی تشدد سے متاثرہ افراد کا بچاؤ، امداد، معاوضہ اور بحالی ریاست کا ایک بنیادی فرض ہے، جو درحقیقت تشدد کے متاثرین کے جینے کے آئینی بنیادی حق سے ماخوذ ہے۔ یہ ذمہ داری کسی بیرونی ادارے کے سپرد کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

اس کام کے لیے ہائی کورٹ کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جو درحقیقت بالکل مختلف، بلکہ مخالف مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد سرکاری املاک کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگانا تھا، جسے فسادیوں سے وصول کیا جانا تھا۔ فرقہ وارانہ تشدد کے متاثرین کو مناسب معاوضہ فراہم کرنے کی اس بڑی ذمہ داری کے ساتھ، کمیشن کو اپنا کام شروع کرنے میں سات مہینے لگے۔ اس کے بعد اس نے متاثرین کو ہونے والے نقصانات کا اندازہ لگانے کے لیے بے ترتیب ڈھنگ سے پرائیویٹ ایویلیویٹر کو مقرر کیا۔

ان پرائیویٹ ایویلیویٹروں کے عمل اور طریقۂ کار کو عام نہیں کیا گیا۔ نہ تو جائزہ لینے والوں نے اور نہ ہی کمیشن نے ان کی بات

باقی صفحہ نمبر ۲

ایشیا شدید عدمِ توازن کی زد میں

Stephen M. Walt

اس وقت امریکی خارجہ پالیسی کو جس نوعیت کے انتشار نے گھیر رکھا ہے، اُس کے ہوتے ہوئے عالمی سیاست کے انتہائی اہم معاملات اور پہلوؤں کا نظروں سے اوجھل رہنا ممکن بھی ہے اور حیرت انگیز بھی نہیں۔ ہم سبھی سگنل گیٹ، روس اور یوکرین کے مذاکرات، یورپ کے حوالے سے ٹرمپ انتظامیہ کی بڑھتی ہوئی ناراضی، تیزی سے پروان چڑھتے ہوئے تجارتی جنگ کے خطرے، امریکا کینیڈا تعلقات میں بگاڑ کی شکل میں اپنے ہی لگائے ہوئے زخم اور امریکا کی حدود میں جمہوری یعنی منتخب اداروں کو کمزور کرنے والے اقدامات میں الجھے ہوئے ہیں۔ اگر آپ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ تمام معاملات بہت الجھانے والے ہیں اور آپ کے لیے ان سب کو جھیلنا ممکن نہیں تو فکر مند نہ ہوں، اس معاملے میں آپ اکیلے نہیں۔

آیئے، میں آپ کو چند لمحات کے لیے خبروں اور تجزیوں کی شہ سُرخیوں سے تھوڑا دور لے جاتا ہوں اور ایک بہت بڑے مسئلہ کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ یہ مسئلہ ہے ایشیائی ریاستوں سے امریکی تعلقات کی بدلتی ہوئی نوعیت۔ اس وقت ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ ایشیا میں امریکا کی شراکت داریوں اور اتحادوں کا مستقبل کیا ہے یا کیا ہوسکتا ہے۔ امریکی وزیرِ دفاع پیٹ ہیگستھ نے ایک بڑا ابھنڈ مارا ہے۔ انہوں نے یمن میں حوثی ملیشیا کے ٹھکانوں پر بمباری کے منصوبے کو ایک غیر محفوظ ایپ کے ذریعے اپنے رفقائے کار کو ٹیکسٹ میسج کی شکل میں بھیجا اور یہ پیغام ایک صحافی کو بھی مل گیا۔ دوسری طرف وہ ایشیا میں امریکا کے شراکت داروں کو طرح طرح کی یقین دہانیاں کرانے میں مصروف ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کیونکہ ایک طرف تو ہیگستھ کی ناتجربہ کاری ہے اور دوسری طرف ٹرمپ انتظامیہ کی غیر متوازن اور نامعقول پالیسیاں ہیں۔ یہ دونوں باتیں مل کر امریکی وزیرِ دفاع کے کام کو انتہائی مشکل بنادیں گی۔

ابھی کچھ دن پہلے تک معاملات یہ تھے کہ میں نے اِس موضوع یعنی طاقت کے توازن کو سمجھانے کے لیے ایک پُرانی کہانی استعمال کی تھی۔ یہ کہانی چین کی تھی جو افلاس زدہ تھا، ٹیکنالوجی میں بہت پسماندہ تھا اور فوج بھی اُس کی بہت کمزور تھی۔ اب چین دنیا کی دوسری بڑی طاقت ہے۔ وہ بحیرۂ جنوبی چین کے پورے خطے پر اپنا بھرپور اختیار رکھتا ہے۔ علاقائی اور عالمی سطح پر معاملات بدل چکے ہیں۔

اس کہانی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ چین میں رونما ہونے والی بنیادی تبدیلیوں اور ترقی کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں نے امریکا کے ساتھ ساتھ چین کے پڑوسیوں کو بھی چوکنا کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں امریکا نے ایشیا میں شراکت داروں کو تلاش کرنا شروع کیا۔ ایشیا کے چند ممالک امریکا کے حلیف رہے ہیں مگر امریکی قیادت کو نئے پارٹنرز درکار تھے تاکہ نئے اتحاد تشکیل پائیں۔ چین کی پیشرفت روکنے کے لیے ایسا کرنا لازم تھا۔ چین کو علاقائی سطح پر بالادستی قائم کرنے سے روکنے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اس حوالے سے امریکا کو بڑے پیمانے پر اقدامات کرنا تھے اور اُس نے کیے۔ امریکی افواج کو دھیرے دھیرے ایشیا میں تعینات کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعد میں AUKUS کی راہ ہموار ہوئی یعنی آسٹریلیا، برطانیہ اور امریکا نے مل کر ایک اتحاد قائم کیا۔ امریکا، جنوبی کوریا اور جاپان کے درمیان سلامتی کے معاملات میں تعاون کے لیے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ ہوا۔ فلپائن کو اس بات پر قائل کیا گیا کہ اپنا راستہ بدل کر امریکا سے گہرے اسٹریٹجک تعلقات قائم کرے۔ اس کے نتیجے میں فلپائن میں امریکی فوج کی موجودگی کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ امریکا نے سلامتی کے معاملات میں بھارت سے بھی تعلقات مضبوط بنانے کی ابتدا کی۔ امریکا، بھارت، جاپان اور آسٹریلیا نے مل کر QUAD کے نام سے اتحاد قائم کیا ہے۔ ان ملکوں کی بحری قوت کے درمیان وسیع تر اشتراکِ عمل کی راہ بھی ہموار ہوئی ہے۔ تائیوان کی حمایت و مدد کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ جون ۲۰۲۱ء میں جاپان کے وزیرِ دفاع نوبوؤ کِشی نے کہا کہ تائیوان کا امن اور استحکام چین کے لیے بلاواسطہ اثرات کا حامل ہے۔

اس کہانی کا سبق بہت نمایاں ہے۔۔ یہ کہ امریکا اور اُس کے ایشیائی شراکت داروں کے پاس اتحاد قائم کرنے اور اسٹریٹجک تعلقات کو مزید گہرا کرنے کے ٹھوس اسباب اور جواز ہیں۔ امریکی ایوانِ صدر میں چاہے کوئی بھی ہو، پالیسی تبدیل نہیں ہوتی۔

ایک امید افزا بات یہ ہے کہ طاقت کا توازن اُسی طور کام کرے گا جس طور بیان کیا گیا ہے اور خطے میں فیصلہ کن بالادستی کا چینی خواب مشکل ہی سے حقیقت کا روپ دھار سکے گا۔

کوئی غلطی مت کیجیے۔ مجھے اپنی سادہ سی کہانی پسند ہے اور میرا خیال ہے کہ اِس میں ایک خاص حد تک سچائی ضرور ہے۔ ہاں، چند ایک معاملات ایسے ہیں جو اس کہانی کو چیلنج کر سکتے ہیں، سوال کھڑے کر سکتے ہیں۔ معاملات کی نوعیت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ یہ کہانی پوری کی پوری قبول اور ہضم نہیں کی جاسکتی۔

یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ چین بالکل پُرسکون ہو کر نہیں بیٹھا ہوا۔ جس طور اُس نے اپنی پسماندگی کو پچھاڑا تھا، بالکل اُسی طور اب وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض معاملات میں چین نے جو ایڈجسٹمنٹ کی ہے، وہ خاصی کامیاب رہی ہے۔ مصنوعی ذہانت کا دور ہے۔ چین بھی اِس شعبے میں اپنے آپ کو منوانے کی طرف رواں ہے۔ امریکا کے مصنوعی ذہانت کے اداروں کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے چین میدان میں آچکا ہے۔ ڈیپ سیک کے ذریعے اُس نے بھرپور انٹری دی ہے اور خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ مصنوعی ذہانت کے چینی ورژن ڈیپ سیک کے سامنے آنے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا کی طرف سے ٹیکنالوجی کے ٹرانسفر اور پیشرفت کی راہ میں پابندیوں کی دیوار کھڑی کیے جانے کے باوجود چین کسی حد تک خود کو زمانے سے ہم آہنگ رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ چین اپنے ہاں کمپیوٹر چپس کی تیاری اور کوانٹم کمپیوٹنگ پر بہت زیادہ فنڈنگ کر رہا ہے۔ وہ بہت سی ماحول دوست ٹیکنالوجی کے حوالے سے اب بھی بالادستی کا حامل ہے۔ الیکٹرک گاڑیاں اِس کی روشن ترین مثال ہیں۔ چینی جامعات اور تحقیقی ادارے تیزی سے پروان چڑھ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ایسے وقت ہو رہا ہے، جب ٹرمپ انتظامیہ چین کی پیشرفت روکنے کے لیے امریکی جامعات اور ماہرین کو چین سے اشتراکِ عمل سے روک رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ امریکا میں تحقیق کے اداروں کی فنڈنگ بھی گھٹائی جا رہی ہے۔ اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ امریکا ہمیشہ ہائی ٹیک کے شعبے میں قائدانہ حیثیت کا حامل رہے گا تو اپنی سوچ بدل لیجیے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایشیا میں امریکا کا (شاید) سب سے بڑا اتحادی جنوبی کوریا شدید سیاسی بحران کا شکار ہے۔ مواخذے کے بعد صدر یون سُک یئول نے مارشل لا نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اگر جنوبی کوریا اپنے موجودہ سیاسی

بحران پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے تب بھی معاشی طور پر شدید نوعیت کی تقسیم سے دوچار رہے گا۔ ایک دور افتادہ امکان یہ بھی ہے کہ جنوبی کوریا میں اپوزیشن لیڈر لی جائے میونگ صدر بن جائیں۔ لی کو امریکا سے تعلقات پر بہت سے تحفظات ہیں۔ وہ ماضی میں چین اور شمالی کوریا کے لیے قبولیت کا اشارہ دے چکے ہیں۔

تیسرے یہ کہ چین کو آبادی کی نوعیت کے حوالے سے مشکلات کا سامنا ہے اور ایسی ہی مشکلات کا جاپان اور جنوبی کوریا کو بھی سامنا ہے۔ چین میں اوسط عمر ۴۴ ہے، جنوبی کوریا میں ۴۵ اور جاپان میں تقریباً ۵۰ ہے۔ امریکا میں اوسط عمر ۳۸ جبکہ چین میں ۴۰ سے کچھ زیادہ ہے۔ بھارت، انڈونیشیا اور فلپائن میں مجموعی طور پر جواں سال افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ ان ملکوں میں اوسط یا درمیانی عمر ۳۰ سال سے کم ہے۔ امریکا، چین، جاپان اور جنوبی کوریا میں آبادی میں اضافے کی رفتار گھٹ رہی ہے اور معمر افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسے میں دفاعی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا انتہائی دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اگر نوجوانوں کو ورک فورس سے نکال کر فوج کا حصہ بنایا جاتا رہے تو اِس کے نتیجے میں معیشت کمزور پڑتی چلی جاتی ہے۔ باصلاحیت اور پُرجوش نوجوانوں کو فوج میں ڈالنا گویا اُن کی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کی راہ مسدود کرنا ہے۔

سوال مل جل کر کسی بڑے اقدام کی تیاری کا بھی ہے۔ اگر کئی ریاستوں کو یکساں نوعیت کے مسائل یا خطرات کا سامنا ہو اور لازم ہو کہ مل جل کر کچھ کیا جائے تب بھی اُن میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اُس کے حصے کا بوجھ کم سے کم ہو اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ برداشت کرنا پڑے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تاریخ میں اس نوعیت کی بہت سی مثالوں کا تذکرہ موجود ہے۔ اور یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ سب کچھ ختم ہونے کا نام نہیں لے گا۔ ہاں، اِتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ مضبوط بنیادوں پر اتحاد قائم کر کے ایسا اشتراکِ عمل یقینی بنایا جائے جس میں ہر فریق کو اپنے حصے کا کام پوری طرح انجام دینا پڑے۔ پائیدار سفارت کاری اور اتحاد کی مضبوط قیادت کے ذریعے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مستقبل قریب میں ایسا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا کیونکہ ہر ملک بہت سے معاملات میں شدید عدم تحفظ کے احساس سے دوچار ہے۔

حالات کا تقاضا ہے کہ چین سے نپٹنے کے معاملے میں جذباتیت سے گریز کیا جائے، بُردباری کا مظاہرہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، چین سے براہِ راست تصادم سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ ٹرمپ انتظامیہ میں ایسے کئی چہرے ہیں جو چین کے معاملے میں انتہا پسندانہ نوعیت کی ذہنیت کے حامل ہیں۔ چین کو ٹرمپ نے بھی امریکا کا سب سے بڑا حلیف قرار دیا ہے۔ چین سے نپٹنے کے حوالے امریکا میں سیاسی بنیاد پر کوئی خاص اختلاف نہیں، سوال طریقِ کار کا ہے۔

امریکا میں بڑے کاروباری ادارے اور شخصیات کو یہ پسند نہیں کہ چین سے تجارتی جنگ کی راہ ہموار کی جائے کیونکہ ایسا کرنے سے اُن کے تجارتی مفادات کو غیر معمولی نقصان پہنچے گا۔ ایلون مسک سے بھی یہ بات برداشت نہیں ہو سکتی کہ چین سے تجارتی جنگ ہونے دی جائے۔ ماضی میں ٹرمپ نے تائیوان کے دفاع کے حوالے سے شکوک کا اظہار کیا ہے اور ٹرمپ انتظامیہ کے ابتدائی اقدامات میں سے ایک کا تعلق تائیوان کے چپ میکنگ ادارے ٹی ایس ایم سی کو اس بات پر مجبور کرنا تھا کہ وہ امریکا میں ۱۰۰/ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرے۔ صدر ٹرمپ خود کو بہت بڑا ڈیل میکر سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس حوالے سے اُن کا ریکارڈ بہت غیر متاثر کُن رہا ہے۔ وہ چاہیں گے کہ اس حوالے سے چینی ہم منصب شی جن پنگ سے کوئی ڈیل کریں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ چینی ہم منصب سے اُن کے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ چین سے تائیوان کے معاملے میں ڈیلنگ کے دوران کیا دے بیٹھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی کو بھی اندازہ نہیں کہ چین کے معاملے میں ٹرمپ انتظامیہ کی حقیقی سوچ یا اپروچ کیا ہے اور صدر ٹرمپ اس حوالے سے کیا کر سکتے ہیں یا کیا کرنا اُنہیں پسند ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح نہیں کہ صدر ٹرمپ مجموعی طور پر پورے ایشیا کے حوالے سے کیا سوچ رکھتے ہیں اور کسی بھی معاملے میں کہاں تک جا سکتے ہیں۔

مزید یہ کہ چین کو نیچا دکھانے کے اسٹریٹجک مقصد یا ہدف اور اتحادیوں اور غیر اتحادیوں کے حوالے سے امریکی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی ٹرمپ کی سوچ میں بہت واضح تضاد موجود ہے۔ ٹرمپ نے اپنے پہلے عہدِ صدارت میں پورے بحرالکاہل کے خطے میں جو شراکت داری لانچ کی تھی، تب سے اب تک ایشیا کے حوالے سے امریکا کی واضح اور سنجیدہ معاشی حکمتِ عملی نہیں رہی۔ بائیڈن انتظامیہ نے بھی اس حوالے سے زیادہ کام نہیں کیا۔ صدر ٹرمپ نے گاڑیوں اور اُن کے پُرزوں پر ٹیرف لگانے کے حوالے سے جو حکمتِ عملی اختیار کی ہے، وہ جنوبی کوریا اور جاپان کے مفادات کو کاری ضرب لگائے گی اور یہ اِن دونوں ممالک سے معاملات طے کرنے کا مثالی طریقہ ہرگز نہیں۔ چین نے معاملات کو اچھی طرح بھانپ لیا ہے۔ چین کے وزیرِ خارجہ وانگ یی نے حال ہی میں جاپانی اور جنوبی کوریائی حکام سے ملاقاتوں میں اُنہیں یقین دلایا کہ تجارت اور استحکام کے حوالے سے مل جل کر کام کرنے کی اچھی خاصی گنجائش ہے اور اِس سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ چینی وزیرِ خارجہ نے یہ بات بھی خصوصی نکتے کے طور پر بیان کی کہ قریبی پڑوسی دور رہنے والے رشتہ داروں سے بہتر ہوتے ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے اہم سرکاری اداروں اور محکموں میں بھی اکھاڑ پچھاڑ کی ٹھان رکھی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایلون مسک سے بہت کام لیا ہے۔ تجربہ کار افسران کی جگہ ٹرمپ اپنے وفاداروں کو لائے ہیں۔ قومی سلامتی کونسل کے معاملات ناتجربہ کار لوگوں کے ہاتھ میں دے دیے گئے ہیں۔ محکمۂ دفاع میں بھی اچھی خاصی اکھاڑ پچھاڑ کی گئی ہے۔ اگر میں ایشیا میں امریکا کا حلیف ہوتا تو ایوانِ صدر اور دیگر اہم ترین حکومتی مقامات اور عمارات میں رونما ہونے والی تبدیلیاں مجھے انتہائی پریشان کرتیں۔

اور آخر میں ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ کیا امریکی حکومتی مشینری کا بنیادی ڈھانچا اس قدر تبدیل کیا جا رہا ہے کہ امریکا کے حلیفوں کو ساتھ رکھنا بہت حد تک ناممکن ہو جائے گا۔ یہ تمام معاملات بہت حد تک مشترکہ اقدار یا اداروں کے مرہونِ منت تھے۔ جنوبی کوریا، تائیوان اور فلپائن میں آمریت رہی ہے مگر پھر بھی امریکا نے ایشیا میں اپنی شراکت داریاں اس یقین کی بنیاد پر مضبوط کی ہیں کہ بہت جلد جمہوری ادارے پروان چڑھیں گے۔ یہ امید بھی رہی ہے کہ ایشیا میں جمہوری حکومتیں پروان چڑھیں گی اور جمہوری ادارے مضبوط ہوں گے۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اب امریکا خود بھی جمہوری اقدار کو ایک طرف ہٹا کر آٹوکریسی یعنی سخت گیر نوعیت کی آمریت نما حکومت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کل تک امریکا چینی قیادت کا تمسخر اڑاتا تھا مگر اب معاملہ کچھ کا کچھ ہو چکا ہے۔ چین اور امریکا کی طرزِ حکومت میں فرق بہت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ امریکی قیادت چینی قیادت پر خودسری اور آمریت کا الزام عائد کرتی رہی ہے۔ اب امریکی قیادت بھی اِسی راہ پر گامزن ہے۔

میں ایک اچھا حقیقت پسند ہوں اور میں اب بھی یہی سوچتا ہوں کہ میری سادہ سی کہانی میں دَم ہے۔ جن ریاستوں میں انتشار پھیل چکا ہو، وہ اندرونی اور بیرونی طور پر ابھرنے

\\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۵ //////

امریکا تباہی کے راستے پر

Uwe Bott

سابق امریکی صدر ولیم جیفرسن کلنٹن نے ایک ایسا جملہ کہا تھا جو اُن کی شناخت بن گیا تھا۔ جملہ تھا ''احمق، یہ معیشت ہے!'' امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اپنے بالکل واضح عالمِ تکبر میں بھرپور سیاسی بصیرت کے حامل نہیں ہیں اور یہ بات اُن کے خلاف جاتی ہے۔

اُن کی غیر معیاری قیادت کے عہد میں امریکا بہت جلد ایسی خطرناک اور تباہ کن نزاکت کا سامنا کرسکتا ہے جو شاید اُن کے کٹر مخالفین کے اندازوں سے بھی کہیں پہلے وارد ہوچکی ہوگی۔ ایسی خرابی کو ٹرمپ سلمپ کہا جا رہا ہے۔

''ٹرمپ سلمپ'' کی وجوہ

ڈونلڈ ٹرمپ جس نوعیت کی خرابی کو جنم دے رہے ہیں، وہ اُن کے یومیہ ماورائے آئین اقدامات کا نتیجہ نہیں جو اس وقت خبروں میں رہنے والے سب سے بڑے آئٹم ہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ سیاسی تبصرہ نگار اور تجزیہ کار امریکا کے لیے ٹرمپ کے ہاتھوں جن خرابیوں کی پیش گوئیاں کرتے رہے ہیں، وہ اُن کے اپنے اندازوں سے کہیں پہلے وارد ہوسکتی ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکی ایوانِ صدر میں ایک اور مدت کے لیے قدم رکھتے ہی سب سے بڑے تجارتی پارٹنرز (میکسیکو، چین، بھارت اور کینیڈا) کے خلاف ٹیرف عائد کرنے یا بڑھانے کا اعلان کیا۔ اس حوالے سے ٹرمپ کے اعلان سے دنیا بھر میں اسٹاک مارکیٹیں ہل کر رہ گئیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے اقدامات اور اعلانات سے اسٹاک مارکیٹوں پر مرتب ہونے والے منفی اثرات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ یہ سب کچھ اگر یونہی رہا تو؟ یہ سوال لوگوں کو پریشان کر رہا ہے۔

جو کچھ ڈونلڈ ٹرمپ کر رہے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اُس سے عالمی سطح پر تو کھلبلی مچی ہی ہوئی ہے، امریکا میں بھی معاملات اچھے نہیں جا رہے۔ بہت سی امریکی ریاستوں میں معاشی نمو سے متعلق اندازے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔

خود امریکی صدر بھی اعتراف کر چکے ہیں کہ وہ جس نوعیت کے اقدامات کر رہے ہیں اور پالیسیوں میں جو تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں، اُن کے نتیجے میں امریکا میں کساد بازاری واقع ہوسکتی ہے۔ صارفین کا اعتماد مجروح ہوچکا ہے۔ لوگ اپنی آمدنی کم سے کم خرچ کر رہے ہیں تا کہ کچھ نہ کچھ بچا کر رکھا جائے۔

جس طور کہیں لینڈ سلائیڈنگ ہوتی ہے اور پتھر گرتے چلے جاتے ہیں، بالکل اُسی طور امریکا میں عام آدمی کا معیشت پر اعتماد لڑھکتا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں مارکیٹ متاثر ہو رہی ہے۔ لوگ کم خرچ کر رہے ہیں۔ ۱۰/مارچ کو شائع ہونے والے نیویارک فیڈرل ریزرو بینک کے ایک سروے کے مطابق امریکا بھر میں لوگوں نے فروری کی اپنی مالیاتی پوزیشن کے حوالے سے غیر معمولی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔

ایلون مسک کی قیادت میں کام کرنے والے محکمے DOGE نے جو اقدامات کیے ہیں، وہ خطرناک نتائج کے حامل ثابت ہو رہے ہیں۔ سرکاری ملازمین کو بڑے پیمانے پر برطرف کیا جا رہا ہے۔ بہت سے محکمے اور ایجنسیاں ختم کی جا رہی ہیں۔ اس کے لیبر مارکیٹ پر غیر معمولی منفی اثرات مرتب ہوں گے اور بہت سے نجی ادارے سرکاری ٹھیکوں سے محروم ہونے کی صورت میں بند ہوں گے اور یوں بے روزگاری بڑھے گی۔

ڈیموکریٹس نے صدر ٹرمپ سے وابستہ بڑے کاروباری اداروں کے بائیکاٹ کی مہم چلائی تو ملک بھر میں ڈیموکریٹک پارٹی سے ہمدردی رکھنے والوں نے بھی بھرپور ساتھ دیا۔ یہ سب کچھ صدر ٹرمپ کے لیے محض مالیاتی خسارے کا باعث نہ تھا بلکہ اُن کی ذاتی توہین تھی۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ صورتحال اُن کی ترجیحات پر بھی اثر انداز ہوگی اور وہ پالیسیوں میں توازن برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہو پائیں گے۔

اگر امریکی صدر نے ٹیرف سے متعلق اعلانات پر عمل شروع کر دیا تو امریکی معیشت کی خرابیاں رواں سال کی پہلی سہ ماہی سے شروع ہوسکتی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ سالِ رواں کی دوسری سہ ماہی کے دوران بھی جاری رہا تو ملک بھر میں شدید نوعیت کی کساد بازاری پیدا ہوسکتی ہے اور یوں معیشت کے لیے مشکلات بڑھیں گی۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ صارفین کے اعتماد کو بحال کرنے کا ہے۔ لوگ ڈرے ہوئے ہیں اور کم سے کم خرچ کرنا چاہتے ہیں۔

عام طور پر فیڈرل ریزرو ایسی کسی بھی صورتحال میں سُود کی شرح کم کرتا ہے۔ امریکا کے مرکزی بینک کے گورنر جیرمی پاول کے پاس غیر معمولی حد تک محتاط ہونے کا جواز موجود ہے۔ اگر ٹیرف نافذ کر دیے گئے تو درآمدی اشیا کی قیمتیں بڑھیں گی، اس کے نتیجے میں سپلائی چین بھی متاثر ہوگی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امریکا بھر میں سپر اسٹورز کے بہت سے شیلف طلب کے مطابق رسد نہ مل پانے کے باعث خالی دکھائی دیں۔

ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ امریکا اپنے دوستوں اور اتحادیوں کو بھی اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے اس معاملے میں غیر معمولی لاپروائی دکھائی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکا کے دوست اور اتحادی قرار پانے والے ممالک کو بھی نشانہ بنانے سے گریز نہیں کیا ہے۔ چین کا معاملہ مختلف ہے مگر میکسیکو اور کینیڈا کے خلاف ٹیرف؟ یہ گویا اِن دونوں ملکوں سے معاشی روابط کو ٹھکانے لگانا ہے۔ یہ سوچنا سادہ لوحی کی انتہا ہوگی کہ یہ ممالک جواب میں کچھ نہیں کریں گے۔

کینیڈا کے متوقع وزیرِاعظم صاف لفظوں میں کہہ چکے ہیں کہ جب تک امریکی قیادت کینیڈا کے لیے احترام کا مظاہرہ نہیں کرتی تب تک کینیڈا کی طرف سے بھی امریکا کے خلاف ٹیرف نافذ رہے گا۔ کینیڈین ریاست اونٹاریو کے سربراہ نے بھی کہا ہے کہ شمالی امریکا کے لیے بجلی کی سپلائی روک دی جائے اور ۲۵ فیصد سرچارج عائد کرنے پر بھی توجہ دی جائے گی۔ اگر اونٹاریو کی انتظامیہ نے کہے پر عمل کیا تو امریکا میں ۱۵/لاکھ صارفین متاثر ہوں گے۔

ڈونلڈ ٹرمپ اور اُن کے رفقا غیر معمولی سطح پر اور غیر معمولی رفتار سے انتشار اور طوائف الملوکی پھیلا رہے ہیں۔ حالت بہت مایوس کن ہیں۔ جو کچھ بھی ٹرمپ نے انتخابی مہم کے دوران کہا تھا، اُس پر عمل کر رہے ہیں۔

معاشی معاملات لیے غیر یقینیت سے بُری اور خطرناک چیز کوئی نہیں ہوتی۔ اور اس وقت ڈونلڈ ٹرمپ کے ہاتھوں یہی ہو رہا ہے۔ حقیقت کچھ اور ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ اور۔ کبھی کبھی معاملات اس لیے بھی خراب ہو جاتے ہیں کہ کسی نے اُن کے بارے میں کچھ ایسا ویسا کہا ہی ہوتا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ کے ہاتھوں رونما ہونے والی خرابیاں بہت زیادہ ہیں اور رفتار بھی کم نہیں۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب اُنہیں اپنی حماقت کا اندازہ ہوگا اور وہ واپسی کا سفر بھی شروع کریں گے۔ فیڈرل ریزرو اس وقت اُن کی بات نہیں مان رہا۔ وہ گورنر کو ہٹا کر اپنی ٹیم لائیں گے جو سُود کی شرح نیچے لائے گی تا کہ ملک میں افراطِ زر بڑھے۔ اس وقت تفریطِ زر پیدا کرنے والے حالات پوری قوت کے ساتھ موجود ہیں۔

\\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۱۵ //////

امریکی راز چُرانا کبھی اِتنا آسان نہ تھا

Noah Shachtman

اگر آپ کسی دشمن ملک کے سیکورٹی اہلکار ہیں تو اس لمحے کو غنیمت جانیں۔ امریکی حکومت کے راز چرانے کے لیے اس سے زیادہ اچھا وقت کبھی نہیں رہا۔ اور جب راز چرانا اتنا آسان ہو جائے تو معلوم نہیں کہ اسے چوری کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ یوں سمجھیں کہ ٹرمپ انتظامیہ نے خزانے کے دروازے کھول دیے ہیں، اس کی حفاظت پر مامور آدھے سیکورٹی گارڈز کو برطرف کر دیا ہے اور باقیوں سے بہت معمولی اجرت پر کام کروایا جا رہا ہے۔ اب آپ جب چاہیں یہاں آئیں اور جو چاہیں لے جائیں۔

موجودہ دور حکومت کے ابتدائی دو مہینوں میں ٹرمپ نے ایسے اقدامات کیے ہیں جو حکومت کو غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کے لیے کمزور بنا رہے ہیں۔ یہ صورتحال صرف دی اٹلانٹک کی جانب سے سامنے لائی گئی گروپ چیٹ تک محدود نہیں ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ نے اعلیٰ عہدیداروں کی چھان بین کے عمل کو کمزور کر دیا ہے، حکومتی رازوں تک رسائی رکھنے والے ہزاروں ملازمین کو جبری طور پر برطرف کر دیا ہے اور خفیہ غیر ملکی اثرات کے خلاف حفاظتی اقدامات بھی کم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ وائٹ ہاؤس کی چھت پر ایلون مسک کے سیٹلائیٹ انٹرنیٹ ٹرمینلز نصب کیے گئے ہیں جو بظاہر سیکورٹی کنٹرولز سے بچنے کے لیے تھے۔ اسی طرح ایلون مسک کی کمپنی کے ایک نوجوان کو حساس حکومتی سسٹمز تک رسائی دے دی گئی ہے۔ یہ نوجوان ’بگ بالز‘ کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کا سائبر کرائم میں ملوث ہونے کا ریکارڈ موجود ہے۔

اپنی پہلی مدت صدارت میں صدر ٹرمپ نے روسی سفیر کو ایسی خفیہ معلومات بتا کر ہلچل مچا دی تھی جو امریکا کے حقیقی اتحادیوں سے بھی مخفی رکھی جاتی تھی۔ اب تو صورتحال مزید خراب ہو گئی ہے۔ اب تو کسی بھی امریکی راز کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو چکی ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ سیکورٹی کو صرف ایک اور فرسودہ روایت سمجھ رہی ہے، جو اس کی تیز رفتاری، بیورو کریٹک اثر و رسوخ کو توڑنے اور اسے ایک طاقتور منتظمہ سے بدلنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ٹیکنالوجی اور فنانس کے لوگوں کو یہ پرانی پابندیاں برداشت نہیں کرنی پڑتیں تو وائٹ ہاؤس کیوں کرے؟

مخالفین اسی قسم کے انتشار، الجھن اور مواقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ ایک خفیہ چینی نیٹ ورک برطرف کیے گئے امریکی سرکاری ملازمین کو بھرتی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نیول کریمنل انویسٹی گیٹو سروس نے کہا ہے کہ غیر ملکی مخالفین ٹرمپ انتظامیہ کی بڑے پیمانے پر برطرفیوں سے ’فائدہ اٹھانے‘ کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم صرف چین اور روس ہی نہیں ہیں جو ٹرمپ انتظامیہ کی جانب سے سیکورٹی کو نظر انداز کرنے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ خفیہ معلومات اکٹھا کرنا اب سب ہی کے لیے آسان ہو گیا ہے۔

نام نہاد ’زیرو کلک اسپائی ویئر‘ اب دنیا بھر کی حکومتوں اور کارپوریشنوں کو فروخت کیا جا رہا ہے۔ ایپل نے ۱۵۰/ممالک کے صارفین کو اطلاع دی ہے کہ وہ اس کا نشانہ بنائے گئے ہیں۔ اسرائیلی اسپائی ویئر بنانے والی کمپنی این ایس او گروپ کا ایک پروگرام سعودی عرب، اسپین، ہنگری، بھارت، میکسیکو اور روانڈا میں استعمال ہو چکا ہے۔ ایف بی آئی کے سابق انسداد جاسوسی ڈائریکٹر فرینک فگلیوزی کا کہنا ہے کہ اب چھوٹے یا ترقی پذیر ممالک بھی جاسوسی میں آسانی سے کامیاب ہو سکتے ہیں، اس کے لیے کسی ملک کو بہت زیادہ جدید ہونے کی ضرورت نہیں۔

یہ وہ وقت ہے جب سیکورٹی کو مضبوط بنانے کی اشد ضرورت ہے لیکن ٹرمپ انتظامیہ کی ترجیحات کچھ اور ہیں۔ تقریباً ایک ہزار ایف بی آئی ایجنٹوں کو ان کے معمول کے کاموں سے ہٹا کر جیفری اپسٹین کی کیس فائلوں کی چھان بین کے لیے لگا دیا گیا ہے۔ نیویارک شہر جو غیر ملکی جاسوسی سرگرمیوں کا گڑھ ہے، وہاں بھی ایف بی آئی کا فیلڈ آفس اپسٹین کیس پر پوری طرح مرکوز ہے۔ دریں اثنا محکمہ انصاف نے نیویارک کے میئر ایرک ایڈمز پر غیر ملکی حکومتوں کے ممکنہ اثرات کی تحقیقات روک دی ہیں۔ روسی تخریب کاری اور سائبر حملوں کے خلاف ۷/ایجنسیوں کا مشترکہ آپریشن معطل کر دیا گیا ہے۔ ایف بی آئی کے انسداد دہشت گردی ڈویژن کے اہلکاروں کو اب ٹیسلا گاڑیوں کو نقصان پہنچانے والوں کے پیچھے لگایا جا رہا ہے جبکہ نئی ’جوائنٹ ٹاسک فورس اکتوبر ۷‘ جامعات میں ’حماس کی غیر قانونی حمایت‘ کی تحقیقات کر رہی ہے۔

جہاں تک اس واقعے کا تعلق ہے جس میں ایک صحافی کو فوجی اور خفیہ ایجنسیوں کے سربراہوں کے ساتھ انتہائی خفیہ گفتگو میں شامل کر لیا گیا تو یہ جاننا مشکل ہے کہ کون سی بات زیادہ تشویشناک ہے، یہ کہ گروپ چیٹ میں موجود لوگوں کو دیگر ممبران کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا یا پھر یہ کہ سینئر حکومتی عہدیدار موبائل فون پر خفیہ بات چیت کر رہے تھے۔ اس گروپ چیٹ کے شرکا نے شاید سوچا ہو گا کہ وہ محفوظ ہیں کیونکہ ان کے پیغامات سگنل ایپ پر انکرپٹڈ تھے، جو دنیا بھر میں رازداری پسند افراد میں مقبول ایپ ہے لیکن کوئی بھی چیٹ صرف اتنی ہی محفوظ ہوتی ہے جتنا اسے استعمال کرنے والے۔

کچھ دن پہلے ہی پینٹاگون نے خبردار کیا تھا کہ روسی ہیکرز لوگوں کو دھوکا دے کر ان کے سگنل گروپ کے پیغامات کو دوسری ڈیوائس پر بھیج رہے ہیں۔ اس کے باوجود ٹرمپ کے خصوصی ایلچی اسٹیو وٹکوف نے ماسکو میں بیٹھ کر اس گروپ چیٹ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

مسٹر وٹکوف نے بعد میں کہا کہ وہ ایک محفوظ سرکاری ڈیوائس استعمال کر رہے تھے، لیکن کسی بھی فون کو مکمل طور پر محفوظ بنانا ناممکن ہے۔ ایس سی آئی ایف نامی وہ محفوظ کمرے جہاں اعلیٰ اہلکار انتہائی حساس گفتگو کرتے ہیں، وہاں فون اندر لے جانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔

سگنل گیٹ کے مرکزی کردار یعنی قومی سلامتی کے مشیر مائیکل والٹز، سیکرٹری دفاع پیٹ ہیگسیتھ، نیشنل انٹیلی جنس کی ڈائریکٹر تلسی گیبارڈ یہ سب جانتے ہیں۔ ان سب نے فوج میں خدمات انجام دی ہیں اور انہوں نے بلاشک و شبہ انسداد جاسوسی کے ماہرین سے حساس ڈیٹا چرانے کے مختلف طریقوں کے بارے میں لاتعداد لیکچر سنے ہوں گے۔ لیکن یہ ایک ایسی انتظامیہ ہے جو ماہرین کی رائے کو سرعام مسترد کرنے پر فخر محسوس کرتی ہے۔ یہ ان لوگوں کو کرپٹ، اصل دشمن، یا ’ڈیپ اسٹیٹ‘ قرار دیتی ہے اور ان کی بات نہ ماننے کو اپنی راست بازی کی دلیل سمجھتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق سیکورٹی اداروں کو وائٹ ہاؤس کی مرضی کے تابع ہونا چاہیے اور اگر اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کے پاس روایتی قابلیتیں نہیں ہیں تو یہ اور بھی بہتر ہے۔ یہ وہ انتظامیہ ہے جو ’فاکس نیوز‘ کے میزبان کو دنیا کی سب سے بڑی فوج کا

سربراہ بنا دیتی ہے، ایک سازشی نظریات رکھنے والے پوڈ کاسٹر کو ایف بی آئی کا انچارج مقرر کرتی ہے اور جس کی سربراہی ایک ریئلٹی اسٹار سے صدر بننے والا شخص کر رہا ہے۔ نتیجے کے طور اس قسم کی حماقتیں ناگزیر ہیں۔

میٹ ٹیٹ ایک معروف سائبر سیکورٹی کنسلٹنٹ اور برطانوی سگنل انٹیلی جنس سروس جی سی ایچ کیو کے سابق تجزیہ کار ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یقیناً ان کے اپنے نجی واٹس ایپ گروپس اور سگنل گروپس ہیں۔ بنیادی طور پر انہیں اپنے ماتحت سول سروسز پر بھروسا نہیں اور یہ روایتی طور پر اختیار کی جانے والی کسی بھی قسم کی پابندیوں کو اپنے اوپر لاگو نہیں سمجھتے۔

آنے والے دنوں میں موجودہ امریکی انتظامیہ کے مداح یہ کہیں گے کہ وفاقی حکومت جن چیزوں کو خفیہ قرار دیتی ہے، ان میں سے زیادہ تر حساس نہیں ہوتیں اور گزشتہ ۲۰ سال یا اس سے زائد عرصے سے تمام حکومتوں کے اہلکار اپنی ذاتی ڈیوائسز پر جنگ اور دیگر امور کے حوالے سے بات چیت کرتے رہے ہیں۔

ان کی یہ دلیل حالیہ سگنل گیٹ کو جواز فراہم نہیں کرتی۔ مسٹر والٹز نے تجویز پیش کی کہ جیفری گولڈ برگ، وہ صحافی جسے یمن پر حملہ کرنے کے حوالے سے بنائے گئے سگنل گروپ میں غلطی سے شامل کیا گیا تھا، شاید ہیکنگ کے ذریعے اس گروپ میں شامل ہوا۔ والٹ کی یہ دلیل تو سیکورٹی خدشات کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیتی ہے۔ مسز گیبارڈ نے دعویٰ کیا کہ گروپ میں ہونے والی بات چیت جس میں جاری امریکی حملے کے اہداف، وقت اور استعمال ہونے والے ہتھیاروں کی تفصیلات تھیں، کسی طرح بھی خفیہ درجہ بندی میں نہیں آتیں اور وجہ سے کوئی راز دراصل لیک نہیں ہوا۔

لہٰذا اگر آپ کسی غیر ملکی انٹیلی جنس سروس کو چلا رہے ہیں تو پرسکون رہیں۔ آپ کے پاس بہت وقت ہے۔ یہ ناکامی ٹرمپ کی ٹیم کو جگانے کے لیے کافی ہوسکتی تھی کہ وہ اپنے سیکورٹی طریقہ کار میں اصلاحات کریں لیکن اس انتظامیہ نے دوسری سمت جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پیٹ ہیگستھ نے صحافیوں کو کہا کہ 'مجھے بالکل معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کوئی بھی جنگی منصوبوں کے بارے میں پیغام رسانی نہیں کر رہا'، حالانکہ وہ بالکل یہی کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔

(ترجمہ: ادارہ)

"Foreign spies to team Trump: us".
("The New York Times". March 26, 2025)

* * *

بقیہ: لبرل اِزم کی بقا کا سوال

دونوں ہی شدید نوعیت کی تقسیم اور محاذ آرائی کا شکار ہیں۔ بہت سے ممالک میں اشرافیہ کو اعتبار کے فقدان کی کمی کا سامنا ہے۔ اگر لبرل معاشروں میں مساوات کو بڑھاوا دیا جائے اور مل کر کام کرنے کی کوشش کی جائے تو سماجی انصاف کی صورت میں غیر لبرل عناصر کی بیخ کنی میں خاصی مدد ملے گی۔

مضبوط قیادت بھی ناگزیر ہے۔ امریکا اور یورپی ممالک کو بہت اچھے قائدین ملتے رہے ہیں۔ اب معاملہ بہت مختلف ہے۔ قابلِ رشک صفات کے حامل قائدین لازم ہیں۔ امریکا اور یورپ کی حکومتیں غیر لبرل حکومتوں کے ساتھ جینے کے چیلنج کا ڈھنگ سے سامنا کرنے سے متعلق اقدامات کر رہی ہیں۔ یہ طے کرنا اس وقت بہت دشوار ہے کہ یہ اقدامات کافی ہیں یا نہیں۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Living with Illiberalism?"
("The Globalist". January 27, 2025)

بقیہ: امریکا تباہی کے راستے پر

مصنوعی اقدامات خرابیوں کو مزید بڑھائیں گے۔ حقائق کی پردہ پوشی تو کی جاسکتی ہے، اُنہیں ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جو ممالک ایسا کرتے ہیں اُن کا انجام ہم نے دیکھا ہے۔ ایک طرف سرکاری ملازمین گھٹائے جارہے ہیں اور دوسری طرف مرکزی بینک کے ماہرینِ اعداد و شمار کو بھی چلتا کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہر جگہ ٹرمپ اپنے غنڈوں کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ آخر میں یہ ہوگا کہ امریکی معیشت کا بھٹّہ بیٹھ جائے گا، دنیا ڈالر کو چھوڑ دے گی اور اندرونِ ملک آمریت زیادہ سے زیادہ پروان چڑھے گی۔ اس کے نتیجے میں امریکا کی بیرونی یعنی عالمی حیثیت داؤ پر لگ جائے گی۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

Say hello to “Trumpslump”.
("The Globalist". March 13, 2025)

* * *

پروفیشنلز اور جدید تعلیم یافتہ افراد سمیت تمام شائقین
علوم اسلامیہ کے لیے خوشخبری
رابطۃ المدارس الاسلامیہ پاکستان سے منظور شدہ
ایک سالہ
علوم دینیہ کورس
مضامین
★ تجوید ★ فقہ
★ حدیث
★ ترجمہ و تفسیر
★ معلم القرآن
خصوصیات
★ ماہر اور شفیق اساتذہ کرام
★ مکمل تعلیمی و تربیتی ماحول
★ بہترین اور جامع نصاب
ہفتہ وار کلاسز
ایام تدریس: بدھ تا جمعہ
6:00 تا 09:00 بجے شام
رجسٹریشن جاری ہے
آغاز 16 اپریل 2025
رابطہ: واٹس ایپ 0333-3251200
اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی | ڈی 35 بلاک 5 فیڈرل بی ایریا | 021 36349840

ایڈورائم ۲۸۰ اور فلسطینی زمینوں کی چوری

اسرائیل کے قابض حکام نے ایڈورائم نامی آؤٹ پوسٹس کے اسٹیٹس کو تبدیل کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ آؤٹ پوسٹس الخلیل کے جنوب میں دراء کی زمین پر قائم کی گئی تھی۔

اس کا قیام ۴ سال پہلے ماہ جولائی میں عمل میں لایا گیا تھا جس میں اب کافی اضافہ ہو چکا ہے اور ۲۶ یہودی آبادکار خاندان رہائش پذیر ہیں۔

یہ آؤٹ پوسٹس اسرائیلی قابض حکومت کی منظوری سے قائم کی گئیں۔ جبکہ باقی آؤٹ پوسٹس کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ حکومتی منظوری کے بغیر قائم ہیں۔ جس زمین پر اسے قائم کیا گیا ہے، وہ دراء نامی فلسطینیوں کی ملکیتی زمین ہے جسے ۱۹۷۰ء میں اسرائیل نے قبضے میں لیا تھا اور اس علاقے میں ایک فوجی اڈا قائم کرنے کا آغاز کیا تھا۔

ڈائریکٹر جنرل آف ڈاکیومینٹیشن اینڈ پبلی کیشن عامر داؤد کا کہنا ہے کہ اس آؤٹ پوسٹس کو مستقل حیثیت دینے کا فیصلہ انتہا پسند اسرائیلی وزیر خزانہ اسموتریچ کی درخواست پر کیا گیا ہے جو مغربی کنارے میں مزید ۵ آؤٹ پوسٹس کو قانونی حیثیت دلوانا چاہتے ہیں۔

عامر داؤد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، نئی یہودی بستی اس پوزیشن میں ہوگی کہ وہ نئے رہائشی یونٹس اپنی مرضی سے تعمیر کرسکیں۔ اس لیے اس آؤٹ پوسٹس کو ایک مکمل یہودی بستی کا درجہ دیا جارہا ہے تاکہ یہ آزادانہ طور پر یہودی بستی قائم کرنے کا اختیار حاصل کرسکیں۔

اعداد و شمار کے مطابق یہودی بستیوں میں مغربی کنارے کے اندر ۷ لاکھ ۸۰ ہزار لوگ رہتے ہیں۔ ان میں یروشلم کے رہنے والے ۳ لاکھ ۱۰؍ ہزار یہودی آبادکار بھی شامل ہیں۔

عامر داؤد کے مطابق اہم پہلو یہ ہے کہ اسرائیل کی مخلوط حکومت میں انتہا پسند وزراء یہودی بستیوں اور ان آؤٹ پوسٹس کے حوالے سے جو عزائم رکھتے ہیں، انہیں اس میں کامیابی ہورہی ہے۔

یہودی آبادکاری میں اضافہ

یہودی آبادکاروں کی زرعی حوالے سے مغربی کنارے کے کھیتوں میں موجودگی مغربی کنارے کی زمین کو یہودیانے کی نئی کوششوں کا ایک اہم مرحلہ ہے کہ وہ کسی بھی صورت فلسطینیوں کی زمین اپنے قبضے میں لے کر اسے زراعت و لائیو اسٹاک کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ ان زمینوں پر اس طرح قبضہ کررہے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کا ہو اور وہ یہ سب اسرائیلی فوج کی نگرانی میں کر رہے ہیں۔

یہودی آبادکاروں کے لیے یہ اہتمام اور سہولت اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ وہ چند آبادکار مل کر زمین کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیں۔ نیز یہودی آبادکار نوجوان بھیڑیں چَرانے کے نام پر اسٹریٹجک اہمیت کی جگہوں پر اپنی موجودگی کو پختہ کرلیں تاکہ آہستہ آہستہ زمینوں پر قبضے کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جائے۔

یہودی بستیوں میں بے ہنگم اضافہ

فروری ۲۰۲۵ء میں جاری کردہ ایک رپورٹ میں اسرائیلی تنظیم کیریم نیووٹ نے لکھا کہ ۲۰۲۴ء کے دوران نئی ۶۰ آؤٹ پوسٹس کا قیام ریکارڈ کیا گیا۔ یہ سب مغربی کنارے کے علاقے میں قائم کی گئی ہیں اور ان کی تعداد ۱۹۹۷ء سے لے کر اب تک قائم کی گئی تمام آؤٹ پوسٹس کا ۲۰ فیصد ہیں۔ واضح رہے ۱۹۹۷ء سے اب تک ۲۸۴ آؤٹ پوسٹس قائم کی گئی ہیں۔

اس ادارے نے یہ بھی کہا ہے کہ ان ۶۰ آؤٹ پوسٹس میں سے کسی ایک کے لیے بھی منظوری نہیں لی گئی اور ان کا قیام غیر قانونی ہے۔ ان ۶۰ میں سے صرف ۲ کو خالی کرایا گیا ہے۔

رپورٹ کے مطابق ان آؤٹ پوسٹس کی تعمیر میں پہلے سے موجود قواعد و طریقہ کار کی بھی خلاف ورزی کی گئی ہے اور کسی بھی کام کے لیے منظوری نہیں لی گئی ہے۔ جبکہ اس سے پہلے ایسا نہیں کیا جاتا تھا۔

ان میں سے اکثر آؤٹ پوسٹس کا پہلے سے انفرااسٹرکچر موجود ہے۔ حتیٰ کہ اسرائیلی پانی کی پائپ لائنز سے بھی یہ آؤٹ پوسٹس جڑی ہوئی تھیں لیکن اکثر آؤٹ پوسٹس میں یہودی آبادی کی زیادہ تعداد نہیں رہتی اگرچہ ان کے پاس زمین کا بڑا علاقہ زیر قبضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مستقبل میں یہودی آبادی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

یاد رہے غزہ کی پٹی پر حالیہ بدترین نسل کشی کے آغاز کے ساتھ ہی اسرائیل نے مغربی کنارے میں زمینوں پر قبضے میں بھی نمایاں طور پر اضافہ کیا۔ ایک جائزے کے مطابق ۲۰۲۴ء کے دوران مقبوضہ مغربی کنارے میں اسرائیلی حکام نے ۲۷ ہزار قطعات اراضی پر مختلف حیلوں بہانوں سے قبضہ کرلیا ہے۔ یہ اعداد پچھلے تین دہائیوں سے بھی زیادہ ہیں۔ اس لیے اسے فلسطینی زمین کی سب سے بڑی چوری کہا جاسکتا ہے۔

خودمختاری قائم کرنے کا منصوبہ

۲۰۲۵ء کے آغاز میں اسرائیل کی وزارتی کمیٹی برائے قانون سازی نے ماہ جنوری میں ایک ایسے مسودہ قانون کی منظوری دی جس کے تحت یہودی آبادکار مقبوضہ مغربی کنارے میں زمین خرید سکتے ہیں۔ اس سے پہلے یہودی آبادکاروں کو مقبوضہ مغربی کنارے میں زمین خریدنے کی اجازت نہیں تھی۔

انتہا پسند وزیر خزانہ اسموتریچ مشرقی یروشلم اور مقبوضہ مغربی کنارے، دونوں کو اسرائیل کا حصہ قرار دیتے ہیں اور وہ دو ریاستی حل کے کٹّر مخالف ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ فلسطین کی آزاد ریاست کو قبول نہیں کرتے۔

انہوں نے اپنے ووٹروں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ ۲۰۲۵ء تک پورے مغربی کنارے کو اسرائیلی قبضے میں لے لیں گے۔

انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے ایک ادارے peace now کے مطابق ۵ لاکھ کے قریب یہودی آبادکار ۱۴۷؍ یہودی بستیوں اور ۲۲۴ آؤٹ پوسٹس میں مقیم ہیں جبکہ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار سے زیادہ یہودی آبادکار مشرقی یروشلم میں قائم کی گئی ۱۵؍ ناجائز یہودی بستیوں میں رہتے ہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ مغربی کنارے کے بعض حصوں کے اسرائیل کے ساتھ الحاق کرنے کے حامی ہیں۔

(بحوالہ: ”مرکز اطلاعات فلسطین“۔ ۱۵؍ مارچ ۲۰۲۵ء)

◆ ◆ ◆

پندرہ روزہ

”مَعارف فیچر“

کے تازہ شمارے اور مضامین

پڑھنے کے لیے دیکھیے:

maariffeature.com

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950